SECOND SELECTION OF THE ASIFIA SERIES.

گنجینۂ اُردو

GANGINA-I-URDU

Approved by the Director of Public Instruction, Hyderabad Deccan, for the 2nd Form in Schools in the Hyderabad State

BY

M. H. JALAL-UD-DIN AHMAD JAFRI,

Arabic and Persian Teacher, Government Intermediate College, Allahabad.

AND

Member of the Anjuman-i-Traqqi-Urdu.
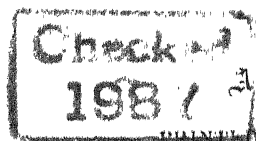
Allahabad:

PRINTED AND PUBLISHED BY

A. W. Jafri, Managing Proprietor,

Anwar Ahmadi Press.

2nd Edition } 1926. { *Price 11 As.*

مؤلفہ

جناب مولوی حافظ سید جلال الدین احمد جعفری زینبی
پروفیسر گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج الٰہ آباد

جسکو

نصاب کمیٹی حیدرآباد دکن نے سکنڈ فارم درجہ (۳) کے لئے

تجویز فرمایا

۱۹۲۳ء

سید عبدالواسع مینیجر مطبع کے اہتمام سے

مطبع انوار احمدی واقع الٰہ آباد میں طبع ہوا

باردوم — قیمت فی مجلد ۱۱ر

فہرست مضامین گنجینۂ اردو

حصۂ نثر

حصۂ نظم

معزز مدرسین

میں نے اس سے پہلے بہت انتخابات تیار کیے جو اکثر صوبوں میں پسند آئے
اور اسکولوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہوئے۔ مگر حال میں میں نے اردو انتخابات
کا اور ایک سلسلہ تیار کیا ہے جس میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے کہ
ایک کے پڑھنے کے بعد دوسرے انتخاب کے پڑھنے کی استعداد پیدا ہو اور ایک سے
ایک مشکل ہو۔ تاکہ طلباء کی استعداد میں خاص ترقی ہوتی رہے اور اسکول
کی تعلیم ختم کر لینے کے بعد اردو زبان کا صحیح طور پر لکھنا۔ پڑھنا۔ بولنا۔ سمجھنا آجائے۔
مگر جب تک آپ لوگ خاص دلچسپی سے طلبا کو نہ پڑھائینگے۔ اُس وقت تک
اُن کی پوری توجہ اِس طرف نہ ہوگی اور کامل استعداد پیدا ہونیکی امید نہیں
کی جاسکیگی۔ اس لئے میں آپ لوگوں کی خدمت میں حسب ذیل التماس کرنا
چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ میرا یہ التماس ناگوار نہ ہوگا اور اُس کی پابندی
کے ساتھ آپلوگ طلباء کو تعلیم دینگے۔ تاکہ اِس انتخاب سے جو میرا اصل مقصود
ہے وہ حاصل ہو۔ اور میری محنت ٹھکانے لگے۔

۱۔ جو سبق آپ پڑھائیں پہلے خود پڑھ کر طلباء کو سُنائیں اور اُس میں
مدّ الصوت اور قصر الصوت تغیر لہجہ کے اصول کو مد نظر رکھیں۔ پھر طلباء سے
اسی طور پر پڑھوائیں اور اس کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ الفاظ صحیح پڑھیں
اضافات کا خیال رکھیں۔ فقروں اور جملوں کے اختتام پر طلباء بقدر ضرورت
توقف کریں۔ رفتار خواندگی بہت زیادہ تیز یا بالکل سست نہ ہو۔

۲۔ تمام مشکل الفاظ اور اصطلاحات کے معانی تختۂ سیاہ پر مختصراً لکھ کر
طلباء کو نوٹ کرا دیجئے۔ اور واضح طور پر اُن کو سمجھا دیجئے۔

۳۔ مرکب الفاظ کی تشریح کیجئے۔ عربی اسماء کی جمع اور مادّے بتلائیے۔

۴۔ ہر فقرے اور جملے کا مطلب اور مضمون کا خلاصہ طلباء کے ذہن نشین کرائیے۔ اور اس کو ایسے طور پر کیجئے کہ وہ خود بھی سب کچھ بخوبی کر سکیں قوتِ بیان ان میں پیدا ہو جائے۔

۵۔ تمام اشعار کا مطلب آسان الفاظ میں ان کو سمجھانا چاہیے۔ اور ان سے خود کہلا دینا چاہیے۔

۶۔ تمام تلمیحات جو اس مضمون یا شعر سے متعلق ہوں اور مصنفین کی مختصر سوانح عمریاں اُن کو بتلائیے۔

۷۔ اقسام نظم و نثر سے بھی طلباء کو واقف کر دینا ایک ضروری امر ہے

۸۔ اس کتاب کے ہر مضمون کے اختتام پر چند مفید سوالات دے دیئے گئے ہیں۔ ان سوالات کو اور اسی طرح کے اپنی طرف سے چند سوالات طلباء سے وقتاً فوقتاً حل کرائیے۔ تاکہ جو مضمون پڑھیں اس کی صرف عبارت پر نظر نہ رہے بلکہ وہ مضامین اُن کے دماغ میں جم جائیں اور اُنکی مدد سے اونچے کلاسوں میں بخوبی مضمون نویسی کر سکیں۔

۹۔ مراتب بالا تا امکان طلبا سے نکلوائیں۔ جس لفظ فقرے۔ جملے۔ کے معنی یا خلاصۂ مضمون وغیرہ کو درجے کا کوئی طالب علم نہ کہہ سکے اُس کو آپ بتلائیں۔

۱۰۔ میری آخری گذارش یہ ہے کہ آپ لوگوں کو ایسی توجہ سے پڑھانا چاہیے کہ طلباء کو اچھی استعداد پیدا ہو جائے اور انکو کورس کی کسی بات کے معلوم کرنے کے لئے شرح کی ضرورت نہ ہو جس پر بھروسہ کر لینے سے طلباء آپکی تعلیم سے فائدہ نہیں پا سکتے۔ وما علینا الا البلاغ

ذاسعاز۔ مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیریں زبانی

شیریں زبانی انسان کے واسطے ایک نہایت عمدہ صفت ہے اور تہذیب انسانی کا ایک بڑا رکن ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جس کے ذریعہ سے انسان بغیر استعانت زور اور زر کے دوسرے انسانوں کی طبیعت پر غالب آسکتا ہے اور اپنے خیالات کو دوسروں کے ذہن میں جھلا سکتا ہے۔ فصاحت اور بلاغت بلکہ ہر قسم کے صنائع و بدائع جو انسان کے کلام کے بہت بڑے رکن ہیں اور جس کے سبب سے آدمی بڑا قابل اور بڑا فصیح و ادیب یا ایک بہت بڑا شاعر مشہور ہو سکتا ہے ان سب کمالات کا صلہ اکثر اوقات زبانی مدح و ثنا سے کافی طور پر ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ کلام جس سے انسان کچھ کام نکال سکتا ہے اور دوسروں کو اس کے ذریعہ سے اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے وہ درحقیقت اس قسم کا کلام ہوتا ہے جس میں شیرینی ہو شیریں کلامی دشمنوں کو بھی دوست بنا لیتی ہے اور تلخ کلامی سے اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں اور بہت سے بنے بنائے کام برباد ہو جاتے ہیں۔

شیریں زبانی انسان کی وہ ذاتی صفت ہے جو اس کو ہر موقع

ہر درجے کے لوگوں کے ساتھ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ۔ ہمقوم ہو یا غیر قوم۔ ہم مذہب ہو یا غیر مذہب۔ دوست ہو یا دشمن۔ امیر ہو یا فقیر۔ سب سے یکساں برتنی چاہئے۔ عمدہ ترین انسانوں میں وہ انسان ہے کہ جو لوگ اُس کو بُرا کہیں اُن سے بھی وہ نہایت نرمی اور ملائمیت سے کلام کرے اور دوسروں کی جہالت اور ناشائستگی کے مقابلہ پر اپنی تہذیب کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ (مشتاق حسین)

سوالات

۱۔ شیریں زبانی کے فائدے بیان کرو؟

۲۔ اُس جوہر کی حالت مفصّل تحریر کرو جس کے ذریعے سے انسان بغیر امداد زور اور زر کے دوسروں کی طبیعت پر غالب آسکتا ہے اور اپنے خیالات دوسروں کے ذہن میں جما سکتا ہے؟

۳۔ فصاحت بلاغت اور ہر قسم کی صنعتِ کلام سے خوش بیانی کیوں بہتر ہے مُشرح بتاؤ؟

۴۔ شیریں کلامی اور تلخ کلامی کے اثر دشمنوں اور دوستوں پر پڑنے سے کیا نتائج پیدا ہوتے رہا ہے؟

۵۔ انسان کو کن کن موقعوں اور کس کس درجے کے لوگوں کے ساتھ شیریں زبانی برتنی چاہیے؟

۶۔ عمدہ ترین انسانوں میں کون انسان ہے؟

راستی

راستی جس چیز کو زیب و زینت دیتی ہے اُس کی خوبی کو بڑھا دیتی ہے جیسے گُل کی خوبی کو اُس کی خوشبو۔ یوں موسمِ بہار میں ہزاروں پھول کانٹوں پہ شگفتہ ہوتے ہیں جو مثلِ گُل اپنی رنگتوں کی چمک اور شوخیاں دکھاتے ہیں۔ مگر جب مُرجھا کر مُرجھاتے ہیں تو زمین پر پڑے سڑا کرتے ہیں

کوئی ان کا گاہک نہیں ہوتا۔ مگر گُل اپنے مرجھانے کے بعد بھی وہ خوشبو بنا جاتا ہے کہ جس سے دِل و دماغ کو فرحت و راحت مِلتی ہے۔ پس اے لڑکو! تم اپنی زندگی گُل کی سی بناؤ۔ کہ اِس عالم سے جانے کے بعد تم سے وہ سچائی کا سَت اور عطر نکلے کہ لوگوں کا دماغ اُس سے معطّر ہو۔ اگر غور سے دیکھو تو سچائی سرتا پا حُسن و جمال ہے کوئی قدرتی خوبی اِس کے مثل نہیں۔ اخلاق کی جان سچائی ہے۔ چہرہ کا جمال خط و خال کا سچا ہونا۔ راگ کا جوہر سُر ملن کا سچا ہونا۔ عمارت کی خوش اسلوبی سچا تناسب۔ شاعری میں گو سراسر جھوٹ بھرا ہوتا ہے مگر جہاں اُس میں سچائی جلوہ نمائی کرتی ہے ایک کمال پیدا کر دیتی ہے۔ غرض جہان میں جہاں سچ کا بول بالا ہے وہیں اُجالا ہے۔ جس میں جھوٹ کا مُنہ کالا دکھائی دیتا ہے۔

سچ وہ ابرِ رحمت ہے کہ جس کی برکت سے عالم سرسبز ہے راستی کا راستہ کیسا سیدھا اور صاف بے خطر با امن و امان ہے کہ جس کے طے کرنے میں بہت کم تکلیف ہوتی ہے۔ وہ ہمارے مقصد تک پہونچانے کا بہت نزدیک راستہ ہے۔ راستی سیدھی راہ چلتی ہے۔ جھوٹ کی چال پیچ در پیچ سانپ کی سی ہے۔ اگر تم سچ کی راہ سے بھٹک گئے تو پھر بھول بھلیّوں میں پڑ گئے۔ جتنا چلوگے اُتنے ہی پھیر میں پڑوگے۔ آخر کو اُس سے نکل نہ سکوگے۔ تھک کے بیٹھ جاؤ گے ہمیشہ کو ناکام رہوگے۔

سچ میں وہ افسوں ہے کہ مُنکر بھی اُس پر مفتوں ہیں۔ جھوٹے بھی اپنے جھوٹ کو سچ بتاتے ہیں اُن کا جھوٹ اور قصّوں کہانیوں کا

جھوٹ وہی زیادہ پسند ہوتا ہے جو سچ کے مشابہ ہوتا ہے۔ سچ میں
وہ تاثیر ہے کہ سب کے دل میں چبھتی ہے۔ اس کی تلخی میں بھی ایک مزا
ہے۔ سچ کے پوچھنے والے بہت ہیں۔ مگر اس کے سننے والے تھوڑے۔
انسان کی فطرت میں یہ امر داخل ہے کہ جھوٹ بولنے میں مزا آتا ہے۔
سچ سننے سے کڑوا آتا ہے۔ جس شخص کو نیکی سے محبت ہے اس کو سچ سے
محبت ہے۔ اس لئے کوئی نیکی نہیں جس کی اصل سچائی نہ ہو۔ برخلاف
اس کے کوئی برائی نہیں جس کی ابتدا جھوٹ سے نہ ہو اگر آدمی یہ عہد کرے
کہ میں سب گناہ کرونگا مگر جھوٹ نہ بولونگا تو اس سے سب گناہ خودبخود
چھوٹ جائیں۔ اس لئے کہ چوری یا جوا کھیلنے یا اور گناہ کرتے وقت
اس کو یہ خیال آئیگا کہ اگر کسی نے پوچھا تو سچ کہنا پڑیگا اور شرمندگی
یا ذلت اٹھانی پڑیگی۔ سچ ہر قسم کی برائی کرنے سے روکتا ہے۔ جھوٹ
تمام گناہوں کی ماں اور سچ سب برائیوں کا ہتھیار ہے۔ سچ کے
پیٹ میں سب نیکیاں ہیں اور جھوٹ کی گرہ میں ساری
برائیاں ہیں۔

بعض حکیموں نے اس کی تحقیقات کی اور حیرانی میں رہے کہ
جھوٹ سے آدمیوں کو نہ شاعرانہ خوشی ہوتی ہے نہ تاجرانہ نفع ملتا
ہے پھر وہ کیوں جھوٹ بولتے ہیں۔ اس کے زہر میں عسل کی حلاوت
جانتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سچ کی نسبت جھوٹ زیادہ
پُر رونق معلوم ہوتا ہے وہ شمع کی سی روشنی ہے۔ جس میں رنگ برنگ
کی نمائش اور بازیاں بڑی خوشنما دکھائی دیتی ہیں۔ سچ ایک آبدار
موتی ہے جو دن میں آب و تاب دکھاتا ہے۔ شبچراغ نہیں جو رات ہی

کی روشنی میں جگمگاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جھوٹ میں لطف زیادہ آتا ہے۔ بیفائدہ دل خوش ہوتا ہے۔ اگر آدمیوں کے دلوں سے جھوٹ کے خیالات اور تعلّی کے توہمات نکل جائیں تو اُن کی ساری اُمنگیں اور ولولے دِل سے نکل کر ایسا افسردہ اُن کو کر دیں جیسے بدن سے کُل خون نکل کر صرف پوست و استخوان باقی رہ جائے۔

بعض آدمی کہتے ہیں کہ ہم سچّے ہیں مگر اُن کے دل پر راستی اِس طرح ثابت نہیں جیسے آسمان پر ثوابت ثابت ہیں۔ بلکہ اُن کا حال شہاب ثاقب کا سا ہے کہ ہوا میں ناچتا ہے اِدھر چمکا اُدھر غائب ہوا راستی اُن کے دل پر پتھر کی لکیر نہیں بلکہ ریت پر نقش ہے کہ ہوا کے جھونکے سے اُس کی شکل مٹتی ہے اور دم پھونکنے سے اُس کی صورت بگڑتی ہے۔ اُن کے دل میں راستی کی روشنی یوں دکھائی دیتی ہے جیسا طوفان باد و باراں میں ستارہ جھلملاتا ہوا۔ گو وہ بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے مگر تھوڑی دیر میں ایسا نظر سے غائب ہو جاتا ہے کہ یہ شبہ پڑ جاتا ہے کہ وہ پہلے دکھائی بھی دیا تھا یا صرف نظر کا دھوکا تھا۔

(ذکاء اللہ دہلوی)

سوالات

۱۔ انسان میں بہ نسبت جملہ دیگر اوصاف کے راستی کو کیوں ترجیح ہے؟
۲۔ گل بہ نسبت دیگر رنگین پھولوں کے کیوں فائق تر ہے؟
۳۔ راستی دنیا کی عام چیز دل میں کیا اثر پیدا کرتی ہے اُس کی چند مثالیں دو؟
۴۔ راستی اور ناراستی کی رفتار دل میں کیا فرق ہے مفصل بتاؤ؟
۵۔ ثابت کرو کہ ہر نیکی کی جڑ سچائی اور ہر بدی کی اصل جھوٹ ہے؟
۶۔ اگر انسان سچ بولنے کا عہد کرے تو اُس سے تمام گناہ کیوں چھوٹ جائیں گے؟
۷۔ جھوٹ بولنے کی لذت کے اسباب بیان کرو؟
۸۔ بعض آدمی جو اپنے آپ کو سچا بتاتے ہیں اُن کے دل میں راستی ثوابت کی طرح

ثابت نہیں ہے بلکہ شہاب ثاقب کی طرح عارضی ہے اس کا کیا ثبوت ہے؟

خوب و زشت

دُنیا انھیں دو چیز کا مجموعہ ہے۔ جب تک شیطان نے نافرمانی نہیں کی تھی ہر چیز اچھی تھی۔ سجدۂ آدم سے شیطان کے انکار نے اور خلقتِ الٰہی کے اُس پہلے کبر و نخوت نے دُنیا میں یہ امتیاز پیدا کیا کہ فلاں چیز اچھی ہے اور فلاں بُری۔

اب ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ کیا چیز اچھی ہے اور کیا بُری اور جس چیز کو ہم اچھا کہتے ہیں اُس میں کوئی بُرائی نہیں اور جس چیز کو ہم بُرا کہتے ہیں اُس میں کوئی خوبی نہیں یا دُوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ جن چیزوں کو ہم بُرا یا بھلا خیال کرتے ہیں کیا وہ حقیقت میں بُری یا اچھی ہیں۔ اُس کے جواب میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر اچھی صفت اور ہر اچھا جذبہ اگر ہم اعتدال سے کام نہ لیں تو بُرا ہے اور ہر بُری صفت اگر ہم اُسے بالکل چھوڑ دیں تو خدا کی کسی بہت بڑی نعمت و رحمت سے محروم ہو جائینگے۔

فرض کرو کسی شخص میں غرور ہے اور وہ خود پرستی کے جوش میں اپنے سامنے کسی کی اصل و حقیقت نہیں سمجھتا۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ بُرائی ہے۔ مگر کیا تم پسند کرو گے اگر یہ جذبہ اُس میں سے بالکل فنا ہو جائے ہرگز نہیں۔ اُس صورت میں اُس میں سے خودداری کی ضروری صفت فنا ہو جائیگی۔ وہ اپنی قدر بھی نہ کرسکیگا اُسے اپنی رائے پر وثوق نہ باقی رہیگا اور اس صورت میں اُسے کسی امر میں رائے قائم کرنے کی جرأت ہی نہ باقی رہیگی اور نہ اپنے حقوق کو سلطنت پہ پبلک یا

سوسائٹی خاندان کے سامنے پیش کرسکیگا۔

اِسی طرح بخل ایک سخت عیب ہے۔ بخیل کی تم بے انتہا مذمّت کرتے اور اُسے حد درجہ کا ذلیل و دنی باور کرتے ہو مگر کیا تمھیں گوارا ہوسکتا ہے کہ اُس شخص میں سے بخل کی صفت بالکل فنا ہو جائے اور کسی کے سوال کو رد ہی نہ کرے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس حالت میں وہ شخص نہایت ہی فضول خرچ ہو جائیگا۔ اپنی محنت کی اُجرت یا اپنے سرمایہ عمر کو ایسی بے جگری سے مٹائیگا کہ چند ہی روز میں تم اُسے بیوقوف بناؤ گے اور کھڑے ہو کے اُس پر ہنسو گے

بزدلی ایک نہایت ہی ذلیل قسم کا انسانی نقصان ہے۔ سب اُسے بُرا خیال کرتے اور بُزدل کا اپنے پاس بیٹھنا بھی مشکل سے گوارا کرتے ہیں۔ مگر کیا کوئی اِس بات کی بھی آرزو کرسکتا ہے کہ بُزدلی سرے سے فنا ہی ہو جائے۔ میں جانتا ہوں کوئی ذی ہوش تو اُسے ہرگز نہ پسند کریگا۔ کیونکہ جس میں بُزدلی کا ذرا بھی مادّہ نہیں وہ زبردست سے زبردست حریف سے لڑ بیٹھیگا اور مارا جائیگا۔ اُس میں اپنے بچانے اور حفاظت کرنے کی قوّت نہ باقی رہیگی۔

اِسی طرح جملہ معائبِ انسانی کی حالت ہے۔ اصل یہ ہے کہ جیسا ہم اوپر بیان کرچکے ہیں ہر چیز کی ضرورت کے موافق اور معتدل درجہ تک ہونے کا نام خوبی ہے اور اُس کے گھٹ بڑھ جانے کا نام زشتی ہے اپنی قدر کرنے کی صفت اگر مفید و مناسب درجہ تک ہو تو خود داری ہے اور اُس سے بڑھ جائے تو وہ کبر و نخوت۔ مال و دولت کی حفاظت کرنے کا جذبہ اگر صحیح حد تک ہو تو کفایت شعاری

ہے اور اِس سے بڑھ جائے تو بُخل۔ دُشمن کی مضرت اور حریف کے حملے سے بچنے کی قوت اگر اعتدال کے ساتھ ہو تو استقلال ہے اُس سے بڑھ جائے تو بُزدلی اور بوداپن۔

خلاصہ یہ کہ بُرائی بھلائی دونوں فی نفسہٖ نہ بُری ہیں نہ بھلی۔ بلکہ وہی ایک محل پر عیب ہوتی ہیں تو ایک محل پر حُسن۔ خود اِن کی ذات میں کوئی خوبی یا خرابی نہیں بلکہ ہم نے اپنے طرزِ عمل سے اُنھیں کبھی اچھا اور قابلِ ستایش بنا لیا اور کبھی بُرا اور مستوجبِ ملامت۔ (شرر لکھنوی)

سوالات

۱۔ دنیا میں بُرے بھلے کا امتیاز کب سے شروع ہوا؟
۲۔ سجدۂ آدم سے شیطان کے انکار کرنے کا قصہ مختصراً تحریر کرو۔
۳۔ بُرائی اور بھلائی میں کیا فرق ہے کن کن صورتوں میں بھلائی بُرائی میں اور بُرائی بھلائی میں تبدیل ہو سکتی ہے؟
۴۔ اگر کوئی مغرور آدمی جو کسی کی کچھ حقیقت نہ سمجھتا ہو۔ اپنے دل سے اِس جذبہ کو دُور کر دے تو کیا نتیجہ پیدا ہوگا۔
۵۔ اگر بخل انسان کی طبیعت سے بالکل زائل ہو جائے تو کیا نتیجہ ہوگا؟
۶۔ اگر انسان بُزدلی کو قطعاً ترک کر دے تو اُس سے کیا کیا نقصانات پیدا ہوں گے؟
۷۔ ثابت کرو کہ جملہ معائبِ انسانی کا ضرورت کے موافق اور معتدل درجے تک ہونا خوبی میں داخل ہے اور اُن کی افراط و تفریط مذموم ہے۔
۸۔ "خوب و زشت" کا نتیجہ تحریر کرو۔

بھلے اور بُرے آدمیوں کی پہچان

نیک آدمی اپنے دشمنوں کے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں جو چندن (صندل) کلھاڑی کے ساتھ کرتا ہے۔ کلھاڑی اُسے کاٹتی ہے

وہ اُس کی دھار کو خوشبودار کرتا ہے۔ اسی لئے چندن کو یہ عزت حاصل ہوئی ہے کہ وہ دیوتاؤں کے ماتھوں پر چڑھتا ہے اور کلہاڑی کی یہ خرابی ہوئی کہ اُس کا سنہ ہتھوڑوں سے کوٹا پیٹا جاتا ہے۔

بھلے آدمی سیدھا مزاج رکھتے ہیں جو خدا نے دیا ہے اُس پر راضی رہتے ہیں۔ دُنیا کی خواہشوں سے آزاد ہوتے ہیں ہر حال میں خوش مزاج رہتے ہیں قناعت کی کان ہوتے ہیں۔ پرائے دُکھ دیکھ کر دُکھی ہوتے ہیں اور دُوسرے کے سُکھ کو جان کر سُکھی ہوتے ہیں تن من دھن سے پرایا بھلا کرتے ہیں۔ اُن کا خواہ کوئی دوست ہو یا دُشمن یا دونوں میں سے ایک بھی نہ ہو۔ وہ اُن سب کے ساتھ محبت والفت شفقت سے پیش آتے ہیں وہ کسی سے دُشمنی نہیں رکھتے۔ اُنھیں غرور اور گھمنڈ نہیں ہوتا۔ حرص و ہوا نہیں لگتی۔ بغض و کینہ کا سایہ اُن پر نہیں پڑتا۔ وہ غریبوں پر مہربانی کرتے ہیں اپنی تعظیم کی پروا نہیں کرتے۔ مگر اور سب کی تعظیم خود کرتے ہیں۔ خاکساری اور تواضع سے پیش آتے ہیں۔ کسی سے ایسی بات نہیں کہتے جو اُس کو کڑوی معلوم ہو وہ اپنے قول و فعل میں سچے ہوتے ہیں۔ کوئی اُن کی ہجو کرے یا تعریف۔ کوئی اُن کی عزت کرے یا ذلت اُن کے نزدیک سب برابر ہیں اُن کو تو خدا پرستی اور انسان کے ساتھ بھلائی کرنے کی لو لگی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسے ہی آدمیوں کو خدا رسیدہ کہتے ہیں۔

اب تم بُرے آدمیوں کی باتیں سُنو۔ کبھی تم اُن کے ساتھ بھول کر بھی نہ بیٹھو۔ اُن کی صحبت سے تم پر بہت بُرا اثر پڑیگا۔ اُن سے تم کو ہمیشہ تکلیف ہی حاصل ہو گی۔ اُن کے دل میں وہ سوزش حسد ہوتی ہے

کہ جہاں پیدا انھوں نے دوسرے کا بھلا دیکھا جل مرے جب کسی کا عیب اور بُرائی سنتے ہیں تو ایسے خوش ہوتے ہیں کہ اُن کے ہاتھ راستہ میں خزانہ لگ گیا۔ غضبناک۔ حریص۔ مغرور۔ بیرحم۔ شریر ہوتے ہیں۔ اُن کے دل میں سب گناہوں کا گھر ہوتا ہے۔ جو اُن کا بھلا کرے اُس کے ساتھ بُرا کرتے ہیں۔ جھُوٹ ہی اُن کا لینا۔ جھُوٹ ہی اُن کا دینا جھُوٹ ہی اُن کا کھانا جھُوٹ ہی اُن کا جینا (یعنی سب چھوٹی بڑی باتوں میں جھُوٹ ہی بولتے ہیں) مُوروں کی طرح بولتے ہیں میٹھے۔ مگر دل ایسے سخت کہ بڑے موٹے سانپ کو نگل جائیں اور ڈکار نہ لیں۔ وہ اوروں کو تکلیف دیتے ہیں ہمسایہ کی دَولت وغیرہ چھیننے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اوروں کی غیبت کرتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کو یوں سمجھو کہ وہ شیطان بصورتِ انسان ہوتے ہیں۔ لالچ ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کھانے پینے میں چوپایوں سے کم نہیں ہوتے۔ موت سے بھی نہیں ڈرتے جب کسی کی بڑائی و ترقی سُنتے ہیں تو ایسی ٹھنڈی ٹھنڈی لمبی لمبی سانس بھرتے ہیں کہ جیسے اُن کو بُخار ہی چڑھ آیا۔ جب اوروں کی مُصیبت سُنتے ہیں تو ایسے خوش ہوتے ہیں جیسے اُن کے ہاتھ کہیں کی سلطنت لگ گئی۔

(مولوی ذکاء اللہ دہلوی)

سوالات

۱۔ صندل اور کلھاڑی کے آپس کے تعلق سے بُرے اور بھلے کے امتیاز کا کیا عمدہ نتیجہ نکلتا ہے؟

۲۔ بھلے آدمیوں کے حالات بیان کرو؟
۳۔ بُرے آدمیوں کے عادات تحریر کرو؟
۴۔ تم کو بھلے آدمیوں کی صحبت اور بُرے آدمیوں سے دُوری کی کیوں ضرورت ہے۔ بذریعہ تمثیل بیان کرو۔

ہمدردی

ہمدردی کا لفظ ہم اور درد دو فارسی کلموں سے مُرکّب ہے درد کے معنی دُکھ اور تکلیف کے ہیں اور ہم کا لفظ اشتراک کے معنی دیتا ہے پس ہمدردی کے لفظ سے دو یا کئی شخصوں کا دُکھ اور تکلیف میں شریک ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ خواہ ارادہ سے خواہ بے ارادہ مگر آجکل کے استعمال میں ہمدردی سے وہ شراکت مراد لی جاتی ہے جو ارادے سے کی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہے اور دوسرا رحم اور محبّت سے اُس کی دواء کرتا ہے۔ تو دُوسرے کو پہلے کا ہمدرد کہینگے۔
اگر یہ بات سچ ہے کہ تمام انسان اصل میں ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں اور ایک ہی دریا کے مختلف شعبے ہیں تو یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ تمام انسان ایک دُوسرے کی ہمدردی کے ذمہ دار ہیں اور ہر شخص مصیبت کی حالت میں اپنے ہمجنسوں سے مدد لینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ کون ہے جو اِس بات سے انکار کریگا کہ بھائی کو بھائی سے ایک تعلّق ہے جو ایک دُوسرے کی ہمدردی پر مجبور کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُن بھائیوں کی اولاد میں اِسی ہمدردی کا کوئی حصّہ باقی نہ رہے۔ بیشک جب تک کہ باپ کے خون کا ہر قطرہ اولاد کی رگ و پے میں باقی ہے ہمدردی کا رشتہ

کبھی منقطع نہیں ہوسکتا۔

ہمدردی اور حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے۔ بچوں کی مدت تک پرورش کرنا۔ اُن کے لئے غذا بہم پہونچانا تا بمقدور اُن کو دشمن کے حملے سے بچانا سب جانوروں کی عام خصلت ہے۔ اس کے سوا عام ہمدردی اُن میں دیکھی گئی ہے۔ جنگلی بطخوں کا غول جب کسی کھیت میں اُترتا ہے اور وہاں کسی طرح کا کھٹکا نہیں پاتا تو سب کے سب ایک صف باندھ کر دانہ چگتے ہیں مگر اُن میں سے ایک بطخ نوبت بہ نوبت اپنے ہمجنسوں کی چوکسی کرتی ہے اور جب تک پہرہ دیتی رہتی ہے ایک دانہ کھاتی نہیں۔ چیونٹا جب کہیں اناج کا ذخیرہ پاتا ہے تو کبھی تن پروری نہیں کرتا بلکہ اُسی وقت اپنے ہمجنسوں کو خبر کر دیتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں لاکھوں چیونٹوں کو وہاں جمع کر دیتا ہے۔ اِسی طرح اور مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔

اِس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہمدردی انسان کی طبیعت میں ضرور رکھی گئی ہے۔ کیونکہ جو خوبیاں قدرت نے اور حیوانات کو عنایت کی ہیں انسان اُن کا زیادہ تر مستحق ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمدردی ایک قدرتی خاصیت ہے جو بغیر تعلیم اکتساب کے انسان کی طبیعت میں خود بخود جوش مارتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حیوانات میں جو عقلی تعلیم سے بالکل محروم ہیں اُن کا وجود ہرگز نہ پایا جاتا۔

ہمدردی انسان میں اِس کے لئے پیدا کی گئی کہ کارخانۂ دُنیا کا انتظام درہم برہم ہونے نہ پائے کیونکہ انسان اپنی ضروریات میں ایک دوسرے کے

محتاج ہیں ایک کی گاڑی دوسرے کی مدد بغیر چل نہیں سکتی۔ سب سے زیادہ حقیر حلال خور (مہتر۔بھنگی) کی قوم سمجھی گئی ہے۔ مگر وہ بھی ایسی ضروری جماعت ہے جس کے بغیر دُنیا کا کام نہیں چل سکتا۔ پس اگر انسانوں میں ہمدردی نہ ہو تو یہ تمام کارخانہ درہم برہم ہو جاے
شاید یہاں یہ شُبہ ہو کہ دُنیا میں جو کام اپنی ذاتی اغراض کے لئے کیئے جاتے ہیں وہ ہمدردی میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کسان زمین کے بونے جوتنے میں کوشش کرتا ہے اور بیوپاری جو مال بھر کر سیکڑوں کوس لے جاتا ہے اُس سے اگرچہ اوروں کو بھی فائدہ پہونچتا ہے مگر اُن کا اصل مقصود اپنا ذاتی فائدہ ہے۔ پس اِس کو ہمدردی کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ جو خصلتیں انسان کو قُدرت نے تعلیم کی ہیں وہ کبھی اُس کے فائدے سے خالی نہیں ہوتیں۔ پس ہمدردی بھی جو آدمی کی قُدرتی خاصیت ہے اُس کے فائدے سے خالی نہیں ہو سکتی۔ جو شخص کسی اپنے ہمجنس کو نفع پہونچاتا ہے وہ حقیقت میں اپنی آسایش کے وسیلے کو تر و تازہ کرتا ہے اور ایک یا چند واسطوں سے اپنی ذات کو فائدہ پہونچاتا ہے۔

ہمارے ہموطن بھی ہمدردی کی اصل سے بیخبر نہیں ہیں۔ کنوئیں بنوانے۔ پیاؤ بٹھانے۔ سبیل لگانے۔ محتاجوں کی خبر لینی۔ بیواؤں کی مدد کرنی۔ بیاہ شادیوں میں شریک ہو کر ایک دوسرے کے کام بنوانے۔ بیمار کی عیادت۔ میّت کی تعزیت اور اسی طرح کی بہت سی باتیں ہمارے مُلک میں بھی پائی جاتی ہیں۔ بعض اوقات

یہ قدرتی خصلت جس کا نام ہمدردی ہے مشق اور تعلیم سے تمام قوم میں پھیل جاتی ہے اور اُس کا اثر کسی قدر تیز ہو جاتا ہے۔

ہم کو ہماری گورنمنٹ طرح طرح سے ہمدردی کی تعلیم دیتی رہتی ہے۔ قومی ہمدردی کا بڑا سرچشمہ سررشتہ تعلیم ہے۔ کیونکہ اُس کے سبب سے بیشمار لڑکوں کو ایک معقول مدت تک باہم میل جول رکھنا پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت کا بیج بویا جاتا ہے۔

پس ضرور ہے کہ جب مدرسہ چھوڑ کر ملکوں میں متفرق ہوں اُن کا تعلق اور رابطہ ہمیشہ برقرار رہے۔ اِس کے سوا گورنمنٹ کا یہ اصول کہ جو چندہ علوم و فنون کی تعلیم کے لئے رعایا کی طرف سے فراہم ہو اُس کے برابر گورنمنٹ کی جانب سے امداد کی جائے۔ ہم کو زبردستی اِس بات کی طرف کھینچتا ہے کہ تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں ہلا کر گرینٹ ان ایڈ (مدد عطیہ) کا استحقاق حاصل کریں اور اپنے ملک میں علم کی روشنی پھیلائیں۔

میونسپل کمیٹیاں جو سرکار نے جابجا شہروں اور قصبوں میں قایم کی ہیں۔ اگر پورا پورا اپنا فرض ادا کئے جائیں اور جس غرض کے لئے مقرر ہوئی ہیں اُسی کو مدنظر رکھیں تو یہ بھی ہمدردی کے اچھے نمونے ہیں۔

علمی یا قومی سوسائیٹیاں جس کی بنیاد صرف انگلش گورنمنٹ کے سبب تو سے ہندوستان میں پڑی ہے اگر اِن میں کچھ جان ہو اور فقط دھوکے کی ٹٹیاں نہ ہوں تو وہ سرجوش چشمے ہیں جن سے تمام ملک

سیراب ہو سکتا ہے۔
زمانہ بھی طرح طرح سے ہم کو ہمدردی کی طرف مائل کر رہا ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کی شائستہ قوم جو ہماری خوش قسمتی سے ہم پر حکمراں ہے اُس کا چال چلن اُس کا اخلاق۔ اُس کا طریق معاشرت اُس کے علوم و فنون۔ اُس کی دانشمندی۔ اُس کی تہذیب۔ اُس کے نئے نئے ایجادات جو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ جب اِن باتوں کو اپنے مُلک میں موجودہ صورت کے ساتھ مقابلہ کریں تو ضرور ہے کہ ہم کو اپنی اور اپنے ہموطنوں کی نہایت وحشیانہ حالت پر افسوس آئے اور ہمدردی کا جوش ہمارے دلوں میں موج زن ہو۔

مذہب بھی ہم کو بہت زور سے ہمدردی کی طرف کھینچتا ہے ہندو مسلمان اگر اپنی مذہبی کتابیں دیکھینگے تو اُن کو ہمدردی کی ترغیب سے مالا مال پائینگے۔

یہ تمام تقریر جو اَب تک کی گئی اس سے تین باتیں ثابت ہوئیں ایک یہ کہ قادرِ مطلق نے اپنے ہمجنسوں کی ہمدردی انسان کی سرشت میں پیدا کی ہے۔ دُوسری یہ کہ ہمدردی کا عملدرآمد قدیم سے کسی نہ کسی قدر ہمارے مُلک میں پایا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ بہت سے اسباب ہمارے دائیں بائیں ایسے موجود ہیں جو ہر وقت ہم کو ہمدردی کی ترغیب دلاتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ ہمارے ہموطنوں میں اعلیٰ درجے کی ہمدردی پائی جائے۔ لیکن انصاف سے دیکھئے تو وہ بے سمجھ چیونٹا جو اپنی فتوحات سے ساری قوم کی پرورش

کرتا ہے اور وہ نادان بطخ جو اپنے ساتھیوں کی نگہبانی میں گھڑیوں ایک ٹانگ سے کھڑی رہتی ہے ہم سے بہت زیادہ اِس فخر کے مستحق ہیں۔

ہمارے مُلک میں تین قسم کے آدمی ہیں۔ ایک دولتمند۔ دوسرے تعلیم یافتہ۔ تیسرے وہ جو نہ دولتمند ہیں نہ تعلیم یافتہ۔ پچھلے گروہ سے مُلک کو کوئی عام فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ مگر پہلے دونوں گروہوں کو مُلک کی ترقی اور بہبودی میں اِس قدر دخل ہے جیسے گورنمنٹ کو بہت سے فائدے ایسے ہیں جو مُلک کو بغیر اُن کی کوشش کے ہرگز نہیں پہونچ سکتے مگر ہمارے وطن کے یہ دونوں گروہ آج تک مُلک کے حقوق سے کچھ بھی سبکدوش نہیں ہوئے۔ دولتمندان میں بے پرواہی سے اور بعض اِس خیال سے کہ ہماری کوشش سے تمام مُلک کی حالت کیونکر بدل سکتی ہے ہموطنوں کی بھلائی کا خیال نہیں کرتے اور جو لوگ بے پرواہی سے اِدھر متوجہ نہیں ہوتے اُن سے ہم پوچھتے ہیں کہ اگر اُن کو بھی ہموطن بھائیوں کی پرواہ نہیں ہے تو کیا اِس بات کی بھی پرواہ نہیں کہ اُن کی دولت کی ترقی ہو۔ اُن کی عزت گورنمنٹ میں زیادہ ہو۔ اُن کی اولاد علم و لیاقت حاصل کرے۔ اُن کے خاندان کی عزت و آبرو ہمیشہ بنی رہے۔ اگر اُن کو یہ تمام خواہشیں ہیں تو میں سچ کہتا ہوں کہ بغیر قومی ترقی کے وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ تمام قوم کسی نہ کسی قدر و عزت کا استحقاق حاصل نہیں کرتی۔ اُس قوم کے چند آدمی اصلی عزت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ جب تک تمام قوم میں علم کی روشنی نہیں پھیلتی

علم کا سلسلہ کسی خاندان میں قائم نہیں رہ سکتا۔ جب تک تمام قوم کے اخلاق درست نہیں ہوتے کوئی شخص خاندان کے اخلاق کی حفاظت نہیں کرسکتا جبتک تمام قوم مرفّہ الحال نہیں ہوتی کوئی شخص دولت و حشمت سے اصلی خوشی حاصل نہیں کرسکتا۔

سوالات

۱۔ "ہمدردی" کیسا لفظ ہے اس کے معنی کیا ہیں اور اس سے مراد کیا ہے؟
۲۔ ثابت کرو کہ تمام انسان اصل میں ایک ہی درخت کی مختلف شاخوں سے مشابہ ہیں اور اس لئے ان میں آپس میں ہمدردی ضروری ہے؟
۳۔ حیوانات اپنے ہمجنسوں کی کس کس طرح مدد کرتے ہیں مثالیں دیکر ظاہر کرو۔
۴۔ حیوانات میں باہم ہمدردی دیکھنے سے انسانی ہمدردی کے متعلق دو کون کون سی باتیں ثابت ہوتی ہیں؟
۵۔ قدرت نے انسان میں کس غرض سے ہمدردی پیدا کی ہے؟
۶۔ ہمدردی کرنا اپنی ذات کو کس طرح نافع ہے؟
۷۔ ہمارے ہموطنوں میں ہمدردی کی کیا کیا باتیں پائی جاتی ہیں؟
۸۔ گورنمنٹ ہمارے ساتھ کس طرح ہمدردی کر رہی ہے؟
۹۔ زمانہ ہم کو کس کس طرح ہمدردی کی طرف مائل کر رہا ہے؟
۱۰۔ ہمدردی کی تقریر سے کون سی تین باتیں ثابت ہوتی ہیں؟
۱۱۔ ہمارے ملک میں کتنے قسم کے آدمی ہیں اور ان میں سے کون کون گروہ ایسے ہیں جن سے ملک کی ترقی کو فائدہ پہونچ سکتا ہے اور کیوں؟

از ماست کہ بر ماست

بنی اسرائیل کو ان کے عروج کے زمانے میں زیادہ تر اسی بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ جتنی بلائیں اور آفتیں آتی ہیں اور جتنی مصیبتوں سے سابقہ پڑتا ہے سب اپنے ہی دنیاوی اعمال کا نتیجہ ہے۔ وہ اعتقاد

رکھتے تھے کہ ہر بُرے بھلے کام کا بدلہ دُنیا ہی میں مل جاتا ہے اور اگر خدا گناہ کی سزا دینے میں دیر لگائے تو توبہ کرنے کے لئے خود ہمیں کو اپنی زندگی ختم کردینی چاہیے۔ یہ اصول اگرچہ بعض حالتوں میں بظاہر اسباب پورا نہیں اُترتا مگر اِس میں بھی شک نہیں کہ اکثر انسان اپنی ہی بد اعمالیوں کے بھگتنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور مذہب والوں نے اگر جزا وسزا کو زندگی سے وابستہ بتایا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بیشک انسان مرنے کے بعد اپنے اعمال کا بدلہ پائیگا مگر کچھ ضرور نہیں کہ اپنے حرکات وسکنات کا پھل اِس دُنیا میں بھی نہ پائے۔

اصل یہ ہے کہ جن امور کو محض خدا شناسی اور رموز توحید سے تعلّق ہے یا یوں کہئے کہ جن باتوں کا معاملہ صرف خدا کے ساتھ ہے اُن میں ہم ثواب یا سزا اُسی عالم میں پائینگے جس عالم سے کہ اُن امور کو تعلّق ہے۔ مگر اخلاقی جرائم جن سے ہم دُنیا والوں کو ضرر پہونچاتے یا دُنیا میں فتنہ وفساد پیدا کرتے ہیں اُن کی پاداش ضرور ہے کہ ہمیں دُنیا ہی میں مل جائے۔ ہم کسی پر ظلم کریں تو یقین کرلینا چاہیے کہ کوئی ہم پر بھی ظلم کریگا۔ ہم کسی کو ستائیں تو دل میں سوچ رکھیں کہ ہمیں بھی کوئی ستائیگا۔ ہم کسی کی توہین کریں تو خوب جان لیں کہ کبھی کوئی ہمیں بھی ذلیل کریگا۔ اور ہم کسی کو نقصان پہونچائیں تو اس میں ذرا بھی شک نہ کریں کہ کبھی کسی کے ہاتھ سے ہمیں بھی نقصان پہونچیگا۔

سچ یہ ہے کہ اگر غور وتعمّق کی نظر سے دیکھیں تو صاف نظر آئیگا کہ اُس عالم آخرت کے دوزخ سے پیشتر خدا نے ہمارے لئے دُنیا میں بھی ایک سخت اور نہایت ہی اذیّت رساں دوزخ تیار رکھا ہے

جس کے عذاب سے شاذ و نادر ہی کوئی بچ سکتا ہے۔ (شرر لکھنوی)

سوالات

۱۔ بنی اسرائیل کو اُن کے عروج کے زمانے میں زیادہ تر کس بات کا یقین دلایا گیا تھا؟
۲۔ انسان اپنے افعال اور اعمال کا نتیجہ صرف عقبیٰ ہی میں پاتا ہے یا دُنیا میں بھی پاتا ہے
جواب بادلائل تحریر کرو؟
۳۔ ثابت کرو کہ اعمالِ نیک و بد کا بدلہ دُنیا میں بھی ملتا ہے؟

مُصیبت میں صبر

مصیبت میں رنج کرنا عبودیت کی شان نہیں۔ رنج و مصیبت کو کوئی نہ ٹال سکتا ہے نہ اُس کو ہلکا کرسکتا ہے۔ بلکہ اُلٹا مصیبت کو بڑھاتا ہے۔ انسان کو اِس زندگی میں ایذائیں بھی پہونچتی ہیں مگر اُن میں ضرور انسان کا کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً طبیب کہ وہ کسی مریض کا علاج کرتا ہے کبھی اُس کو کڑوی دوا پلاتا ہے اور کبھی اُس کی فصد لیتا ہے۔ اور کبھی بیمار کے زخم کو شگاف دیتا ہے اور کبھی شاید اُس کے کسی عضو کو کاٹ بھی ڈالتا ہے۔ مگر ایسا کرنے سے کیا کوئی شبہ کرسکتا ہے کہ طبیب اپنے بیمار کے ساتھ عداوت رکھتا ہے اسی طرح جو تکلیفیں ہم کو دُنیا میں پہونچتی ہیں۔ اور بلاشبہ خُدا کی مقدس مرضی سے پہونچتی ہیں ظاہر میں تکلیف ہیں۔ اور باطن میں آرام۔ ابتدا میں ایذا ہیں اور انجام میں راحت۔

اوّل تو اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ جو تکلیف پہونچتی ہے حقیقت میں بھی تکلیف ہے یا نہیں۔ مانا کہ جو تکلیف ہم کو پہونچی حقیقت میں تکلیف ہے تو کیا شفیق باپ اپنے پیارے بیٹے کو منصف اور رحم دل بادشاہ اپنی

عزیز رعیت کو تادیب یا تنبیہ یا اصلاح یا کسی دوسری مصلحت سے ایذا
نہیں پہونچاتا۔ ہمیشہ ایسی ایذائیں پہونچتی رہتی ہیں۔ نہ فریاد۔ نہ شکایت
پس اگر خدا کی طرف سے ایک ایذا پہونچ جائے تو بندہ کیوں منہ پھلائے
کس لئے بڑبڑائے۔ سب سے بڑا فائدہ جو مصیبت سے انسان کو
پہونچتا ہے۔ یہ ہے کہ مصیبت دل میں بالتخصیص عجز و انکسار کی
صفت پیدا کرتی ہے اور خدا کو یاد دلاتی ہے اور حقیقت میں مصیبت
کے وقت خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ مصیبت نہیں رحمت ہے۔
لیکن خدا کو یاد کرنے اور اس کی طرف رجوع کرنے کے یہ معنی نہیں
ہیں کہ شکایت کرو اور اس سے ناراض رہو۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں
کہ اس کی رحمت پر پورا بھروسہ اور اعتماد کرکے صمیم قلب سے
یقین کر لو کہ جو کچھ ہوا خوب ہوا۔ مناسب ہوا۔ اور یوں ہی ہونا چاہیے
تھا۔ یہ تو درجہ رضا و تسلیم کا ہے۔ اور اسی کا نام صبر جمیل ہے اور آدمی کو
جس کا عقیدہ ضعیف اور جس کا دل کمزور اور جس کی ہمت کوتاہ اور جس کا
ارادہ متزلزل ہے اِس درجے پر پہونچنا دشوار ہے۔ مگر اعلےٰ علیین پر
نہیں پہونچ سکتے تو ایک سیڑھی ہے دو سیڑھی جتنا ہوسکے کچھ تو اُچکو۔
کسی قدر۔ تو اُبھرو کہ اسفل السافلین کفران سے نکلو۔

یوں کہنے کو منہ سے سبھی کہتے ہیں کہ دنیا فانی ہے چند روزہ ہے
خواب ہے۔ سراب ہے۔ سایہ ہے۔ سحاب ہے۔ برق بیتاب ہے۔ مگر
مصیبت کے وقت بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ زبان ہمارے دل کا سچا
ترجمان نہیں۔ کیا کوئی فانی ایک فانی حالت کے لیے اتنا غل مچاتا
اور اِس قدر روتا پیٹتا ہے۔ مصیبت پر جو منفعت ہم نے ہمیشہ ترتیبا

ہوتے دیکھی تو وہ یہ ہے کہ مصیبت آدمی کے مستقبل کو اس کے ماضی سے ضرور بہتر کر دیتی ہے۔ یعنی انسان اگر کاہل تھا تو مصیبت کے بعد ضرور چُست و چالاک ہو جاتا ہے۔ آرام طلب تھا تو جفاکش۔ بھولا تھا تو سیانا۔ مُسرف تھا تو کفایت شعار۔ بدپرہیز تھا تو محتاط جلد باز تھا تو دھیما۔ آوارہ تھا تو نیک کردار۔ جس آدمی پر کبھی مصیبت نہیں پڑی نہ اُس کی عقل کا ٹھکانا نہ اُس کی رائے کا بھروسہ نہ اُس کا دین درست نہ اُس کے اخلاق شائستہ۔

اس کے علاوہ آدمی کا دستور ہے کہ ایک حالت کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو اگر ساری عمر یکسانی کے ساتھ چلی جائے تو اُس حالت کی عمدگی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ بلکہ اُکتا کے خود اُس حالت سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ ایک باورچی نمکین اور میٹھے چاول یعنی بریانی متنجن وغیرہ پکانے میں کامل اُستاد تھا۔ شہر میں کہیں نہ کہیں شادی یا غمی کی کوئی نہ کوئی تقریب لگی رہتی تھی۔ جب کسی کے ہاں چاولوں کی پخت ہوتی اُسی باورچی سے پکواتا۔ اور اُس کو مزدوری کے علاوہ دستور کے مطابق تہ دیگی کی چھوٹی دار رکابی بھی ملتی۔ وہ ایک رکابی ایسی ہوتی تھی کہ اُس کا سارا گھر اُس کو کھا کر اَپھل ہو جاتا۔ غرض کہ اُن لوگوں کو دونوں وقت عمدہ سے عمدہ اور بہتر سے بہتر متنجن کھانے کو ملتا تھا۔ پس یہ ایک حالت تھی کہ اگر کسی غریب آدمی کے سامنے جو بریانی متنجن کو ترستا ہو بیان کیجئے تو سنتے کے ساتھ ہی رال ٹپک پڑے۔ مگر اُس باورچی اور اُس کے اہل و عیال کا کیا حال کہ ہنستیں کر کے بریانی متنجن کی

رکابیاں ہمسائے کے لوگوں کو دیتے اور اُن سے روٹی چٹنی مانگ کر کھاتے۔

پس ہم نے تندرستی کی قدر بیماری سے جانی۔ وطن کی پردیس سے۔ توانگری کی مفلسی سے۔ آرام کی دُکھ سے۔ راحت کی مصیبت سے۔ تو جو شخص حقیقی راحت کا خواہاں ہے ضرور ہے کہ مصیبت کا بھی مزہ چکھے۔ مصیبت زدہ کے لیے سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ وہ دُوسرے مصیبت زدوں پر نظر کرے۔ مثلاً اُس کو صرف بیوگی کی شکایت ہے تو جواب پائیگی کہ اُس جیسی اور اُس سے بدتر لاکھوں بیوہ عورتیں اور بھی ہیں۔ شاید یہ ایک مدت تک خانہ داری کرنے کے بعد بیوہ ہوئی ہے۔ اور ہزارہا اللہ کی بندیاں ایسی بھی ہیں جنھوں نے شوہر کی صورت تک نہیں دیکھی۔ پس بیوگی کے علاوہ لاوارث بھی ہیں۔ اور شاید اُن کو روٹی کا بھی کہیں آسرا نہ ہو۔ پس بیوہ اور لاولد ہونے کے علاوہ محتاج بھی۔ نکھری ندری بھی۔ اور شاید دُکھیا بیمار بھی۔ اور شاید اندھی اور لولی اور اپاہج بھی۔ کسی کو اگر کھجلی کی ایذا ہے تو وہ دیکھیگا اپنے ہی جیسے آدمی کوڑھی اور کوڑھ میں کیڑے اور کیڑوں کے ساتھ زخم۔ اور زخموں میں سوزش۔ العیاذ باللہ۔ جس کی آنکھ میں ناخنہ ہے کیا اُس کو اس سے تسلّی نہیں ہوگی کہ دوسروں کے آنکھ میں ٹینٹ یا دُوسرے کانڑے بلکہ اندھے بھی ہیں۔ غرض دُنیا کا حال یہی ہے کہ ایک سے ایک بہتر ہے۔ پھر کیوں کوئی مغرور ہو۔ اور ایک سے ایک بدتر ہے تو کس لئے کوئی ناصبور ہو۔

(نذیر احمد دہلوی)

سوالات

۱۔ بذریعہ تمثیل ثابت کرو کہ انسان کی مصیبت میں بھی اُس کا کوئی نہ کوئی فائدہ ہی مضمر ہوتا ہے؟
۲۔ مصیبت کا سب سے بڑا فائدہ انسان کے لئے کیا ہے؟
۳۔ اعلٰی علیین اور اسفل السافلین کی تشریح کرو؟
۴۔ مصنّف نے مصیبت کا کونسا فائدہ خود مترتّب ہوتا ہوا دیکھا ہے؟
۵۔ اگر آدمی ہمیشہ آرام اور آسایش ہی میں رہے تو اُسے مصیبت کی ضرورت کیوں پڑتی ہے اس کے ضمن میں باورچی کا بریانی سے چٹنی روٹی تبدیل کرنے کی تمثیل بیان کرو؟
۶۔ ثابت کرو کہ بلا مصیبت اُٹھائے آرام و آسایش کی قدر نہیں ہوتی؟

کاہلی

اطبّا اور حکما نے اُن بیماریوں کے بیان میں بھی بہتیرے رسالے لکھے ہیں جو پیشے حرفے اور کام کاج سے پیدا ہوجاتی ہیں۔ مثلاً کنب سمندر اور کان میں رہنے سے بعض امراض لاحق ہوجاتے ہیں۔ دھاتوں کے رگڑنے اور آئینوں وغیرہ پر پارہ چڑھانے سے بعض روگ لگ جاتے ہیں۔ مگر اِس میں سب کا اتّفاق ہے کہ پیشہ اور کام صحّت کے لئے خواہ وہ کیسا ہی خطرناک اور مُضر کیوں نہو تاہم کاہلی اور بیکاری سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ کیونکہ اُس میں کچھ نہ کچھ دلچسپی اور خوشی ضرور ہوتی ہے جو تندرستی کا باعث ہے کاہلی میں کچھ بھی نہیں۔ اوّل تو انسان کے جسم کی بناوٹ ہی کہے دیتی ہے کہ یہ ضرور کسی نہ کسی کام کے لیے بنایا گیا ہے۔ دوسرے تمام دُنیا کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کے لئے کوئی نہ کوئی کام ضرور چاہئے۔ دیکھو جو لوگ دولتمند اور فارغ البال ہیں اور اُن کو روپیہ کمانے کے واسطے محنت مشقّت

کرنے کی کچھ ضرورت نہیں اُنھوں نے بھی سیر و شکار اور اور مشغلے ایسے نکال رکھے ہیں جن میں اتنی ہی محنت پڑجاتی ہے جتنا پیشہ وروں اور مزدوروں کو۔ گو اس میں محنت کے لئے ایسی مجبوری نہیں جیسی کہ کاشتکار اور بیلدار کو ہوتی ہے۔ شکار کے لئے وہ علی الصباح اُٹھتے ہیں اُس کی تلاش میں کوسوں مارے پھرتے ہیں بہتیری طرح کی جوکھوں میں پڑتے ہیں۔ سردی گرمی کی تکلیفیں برداشت کرتے ہیں دریاؤں کے پار جاتے ہیں۔ پہاڑوں پر چڑھتے ہیں۔ کبھی جھاڑیوں میں پھنس جاتے ہیں۔ غرض بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھاتے ہیں۔ حالانکہ اُن کی اِس گرمجوشی کا تحریک کرنے والا اور اُن پر کوئی سپہ سالار حکم چلانے والا نہیں ہوتا جس کی عدول حکمی یا کسی سزا کا خوف اُن کے دل میں ہو۔ نہ اِس کام سے اُن کو کسی قسم کی عزت اور صلے کی اُمید ہوتی ہے اگر اُن کے چند ہمراہیوں اور ماتحتوں نے کہدیا کہ واہ واہ خوب شکار مارا۔ کیا عمدہ نشانہ لگا ہے تو اِس سے کیا ہوتا ہے۔ بات یہی ہے کہ خود اُن کی طبیعت اُن کاموں کی محرک ہوتی ہے اور چاہتی ہے کہ اُن کو نکما بٹھاکر کاہل نہ ہونے دے جس سے یہ طرح طرح کی خرابیوں اور قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوجائینگے۔

غرض انسان کی جسمانی ترکیب کا مقتضا محنت کرنا ہے محنت خود اپنا آپ انعام ہے اس کے لئے کسی اور ترغیب کی ضرورت نہیں اِس سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور اِسی سے مصیبت اور آفت سے بچاؤ ہوتا ہے۔

آدمی اپنی بے حس و حرکت زندگی سے آرام چاہتا ہے۔ مگر آرام تو خوشی اور رنج کی درمیانی حالت کا نام ہے۔ جو شخص اپنے رگ و پٹھوں کو سخت بناتا ہے اور اپنے اعضا کو حرکت دیتا رہتا ہے اور سردی گرمی میں رہکر جسم کو اُس کی برداشت کی عادت ڈالتا رہتا ہے اُس کے واسطے اہتزاز روحانی و قوت جسمانی ہے۔ اور وہ مہمات عظیم کے سرانجام کے لئے ہر وقت مستعد ہے جس آرام سے خوشی نہیں حاصل ہوئی وہ آخرکو دُکھ ہو جاتا ہے۔ جب آدمی اپنے اعضا کو حرکت نہیں دیگا تو وہ سُست ہو جائینگے۔ اور دُکھ درد پیدا کرینگے زندگی کے واسطے غذا اور محنت میں ہمیشہ ایک نسبت ہوتی ہے غذا بدل ما یتحلل ہونی چاہئے۔ وہ کاہلی سے نہیں ہوتی۔ اگر کاہل آدمیوں کی عُمر بھی دراز ہوتی ہے تو بڑی مصیبت سے کٹتی ہے گو ورزش جسمانی ہم کو موت سے تو نہیں بچا سکتی۔ مگر جب تک جسم و رُوح میں صحبت ہے وہ اُن کو خوش رکھتی ہے۔ اور یہ تالیگا ان میں جُدائی بھی آسانی سے کرادیگی۔ متقدمین کا یہ مقولہ ہے کہ امراض مزمنہ ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ موت کا تیر تو آسمان کی طرف سے لگتا ہے لیکن زہر میں ہم اِس کو اپنی بد چلنی سے بُجھا لیتے ہیں مرنا تو انسان کی قسمت میں ہے مگر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا اُس کی بیوقوفی سے ہوتا ہے۔

اِس دُنیا میں ہماری تکمیل کے لئے ضرور ہے کہ جسم و روح دونوں کام کرتے رہیں۔ دونوں قوتوں میں سے کوئی ایک بھی کاہل نہیں رہنا چاہئے۔ اور اُن سے کام لینا چاہئے۔ نہ حالت کی طاقت

سے صحت مول لینی چاہئے نہ صحت کو خرچ کرکے علم کو خریدنا چاہئے۔ طلبا کو اس پر فخر و ناز ہوتا ہے کہ ہم کو علمی خوشی حاصل ہے۔ اور وہ کھیل تماشوں کو جن سے جسم کو تر و تازگی اور روح کو مسرت حاصل ہوتی ہے ناپسند کرتے ہیں۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔ اور اگر وہ گیند کو ہاتھ نہ لگائیں اور گرنے کے خوف سے دوڑیں نہیں تو یہ اُن کی بے ہنری ہے۔ جو ایسے خوف رکھتے ہیں وہ ضرور ذلیل ہوتے ہیں۔

جو عالم و فاضل اپنے کو مطالعۂ کتب سے تھکاتے ہیں اور ورزشِ جسمانی سے گریز کرتے ہیں وہ خود اپنے تئیں کاہل و مریض بناتے ہیں اسی لیے تعلیم میں ریاضت جسمانی داخل کی جاتی ہے۔ کہ جب آدمی روحانی محنت سے تھک جائے تو جسمانی محنت میں مصروف ہو کر روح کو آرام پہونچائے مہذب ملکوں میں اسی لیے عورتوں کے واسطے تعلیم کے اندر یہ بات مقرر کر دی گئی ہے۔ کہ خواہ کسی درجے اور رتبے کی ہوں وہ ضرور کوئی لیاقت کا کام سیکھیں۔ جس میں اُن کی ورزشِ جسمانی ہو۔ حکیموں کا ایک پرانا مقولہ ہے کہ خلا محال ہے۔ پس اس کے موافق دل خالی نہیں رہتا ہے۔ بلکہ وہ کاہلی کی حالت میں بڑی شرارت کے منصوبے باندھتا ہے۔ ہر ایک آدمی جانتا ہے کہ جب وہ خالی ہوتا ہے تو کیا کیا خیالات پریشان اور وحشیانہ آرزوئیں اور تصوّر باطل پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے آدمی کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ جسم و جان دونوں کو کام میں مصروف رکھے۔ اور کبھی کاہل نہ ہونے دے۔

(مولوی ذکاء اللہ)

سوالات

۱۔ پیشے حرفے اور کام کاج میں پڑ کر اگر آدمی کو روگ لگ جائے تو وہ بھی کاہلی سے

لاکھ درجے کیوں بہتر خیال کیا جاتا ہے؟
۲۔ دولتمند اور فارغ البال لوگ سیر و شکار وغیرہ کیوں اختیار کرتے ہیں؟
۳۔ محنت کے فوائد بیان کرو؟
۴۔ اگر آدمی اپنے اعضا کو حرکت نہ دے تو اُس کا کیا نتیجہ ہوگا؟
۵۔ انسان کی زندگی کے واسطے غذا اور محنت میں باہم کیسا تعلق ہے؟
۶۔ کاہلی کے نقصانات تحریر کرو؟
۷۔ جسم و رُوح دونوں کا فعل تکمیل انسانی کے لئے کیوں ضروری ہے؟
۸۔ تعلیم کے ساتھ ورزش جسمانی کو کس غرض سے شامل کیا گیا ہے؟
۹۔ کاہل آدمی کے دل کی کیا حالت رہتی ہے؟

سعی بے حاصل

کچھ کرو۔ اور کیے جاؤ۔ کیونکہ تم کرنے ہی کے لئے پیدا ہوئے ہو۔ تم اُسی وقت تک زندہ ہو جب تک کچھ کرتے ہو۔ تمہارا کچھ کرنا رُکا اور سمجھ لو تم نہیں۔ کام تمہارا زندگی کا شعار ہے۔ اور انسانی ہستی کے علم کا نارکہ ہے۔ کوئی ترقی کا آسمان۔ کوئی بلند ہمتی کا عرش اوپر دکھائی دے تم اُس کی طرف اڑو۔ کوئی اُلوالعزمی کا شہ نشین اور کوئی عالی حوصلگی کی مسند نظر آئے اور تم اُس کی طرف دوڑو۔ کوئی ہزار روکے نہ رُکو۔ ہزار منع کرے نہ مانو۔ دلیری و استقلال کے ساتھ بڑھتے چلے جاؤ۔ کیونکہ ناکامیاں نہ چلنے ہی میں ہیں چلے اور پہنچے۔ مگر ہاں شرط یہ ہے کہ تمہارے کام میں سچی سعی کی شان پیدا ہوئی اور دُشواریوں اور ناکامیوں مزاحمتوں اور مصیبتوں کی یہ خطرناک گھاٹی سی جو سامنے نظر آرہی ہے وہ ہٹ جائیگی۔ اور تمھیں شاہد آرزو کا جلوہ نظر آجائیگا۔

جب کبھی ہم کسی دشوار اور اپنی حیثیت سے بڑھی ہوئی آرزو کے حصول کے لیے قدم مارتے ہیں۔ یا کسی ایسے کام کو شروع کرتے ہیں جس میں کامیابی مشکل نظر آتی ہو اکثر احباب کی ناصحانہ زبان سے سنتے ہیں۔ "بے فائدہ محنت سے کیا حاصل"؟ اور "اس سعی بے حاصل کا کیا نتیجہ"؟ مگر آہ! وہ یہ نہیں جانتے کہ حرکت ہی میں برکت ہے۔ اور لاحاصل۔ بے نتیجہ۔ دشوار۔ مشکل۔ بلکہ محال غیر ممکن۔ اور اسی طرح تمام ہمت شکن الفاظ سب انھیں لوگوں کے لیے ہیں جو ان الفاظ کو ان کے متعارف معنوں میں لیتے ہیں۔ ساری مشکل تمہارے مشکل جاننے سے ہے۔ اور تم محال نہ جانو تو حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز محال نہیں ہے۔ کیا تم نے اس اولوالعزم نپولین بونا پارٹ کا قول نہیں سنا جو یہ کہتا تھا کہ لغت سے محال کا لفظ نکال ڈالنا چاہیے۔ کیونکہ محال اور غیر ممکن کوئی چیز نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ فائدہ یا نتیجہ ہو یا نہ ہو کچھ کرتے رہنا ہماری فطرت ہے اور بے کچھ کیے ہم رہ نہیں سکتے۔ ہمارے دل میں جس وقت کوئی جوش یا خیال پیدا ہوتا ہے ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ جوش جس طرح سے ہو ہاتھ پیر چلانے سے نکلے۔ لہٰذا ہمارا کام ہے بلا لحاظ اس کے کہ کامیابی ہوگی یا ناکامی ہاتھ پاؤں ماریں اور کوشش کا دامن پکڑ لیں چاہے وہ چھوٹ کر ہمارے ساتھ رہ جائے۔

(شرر لکھنوی)

سوالات

۱۔ شاہد آرزو کا جلوہ نظر آنے سے کیا مراد لیا ہے؟

۲۔ اگر کسی دشوار اور اپنی حیثیت سے بڑھے ہوئے کام کا ارادہ کریں اور ہمارے دوست منع کریں تو ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟

۳- محال اور ناممکن کے لیے نپولین کا کیا قول ہے؟

صحّت اور مرض

ایک صحت ہزار نعمت ہے۔ تندرستی سے بڑھکر دُنیا میں کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔ پس تندرست رہنا غنیمت ہے۔ بیماری ایک طرح کا عذاب ہے جو تکلیف کے علاوہ آدمی کے سب کام بند کر دیتی ہے۔ اگر بیماری کا رنج کسی کو ہو تو تمام دُنیا کے عیش و آرام اُس کی نظر میں ہیچ ہو جاتے ہیں۔ نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے نہ کھانا مزے کا معلوم ہوتا ہے نہ کسی مشغل میں جی بہلتا ہے۔

واضح ہو کہ بیماری موت کا پیام ہے۔ موت بے بیماری کے بہت کم آتی ہے۔ اور جب بیماری سخت اور عرصۂ دراز کی ہو جاتی ہے تو اکثر انجام کو موت ہے۔ پس بیماری سے زیادہ انسان کا کوئی دشمن نہیں۔ جہاں تک ہو سکے اِس دشمن سے بچو۔ اور اِس دشمن کو اپنے پاس مت آنے دو۔ اب تم پوچھوگے کہ بیماری کو کوئی شخص اپنی خواہش سے بُلاتا ہے۔ سب دُکھ سُکھ خُدا کی طرف سے ہیں۔ اگر بیماری کی تکلیف تقدیر میں بدی ہو تو کس کے ٹالے ٹلتی ہے اس سے بچنا کس کے اختیار میں ہے اور اگر بیمار ہونا اختیاری بات ہوتی تو دُنیا میں کوئی بیمار نہ ہوتا۔ شاباش بات تو معقول پوچھی لیکن سمجھو کہ بدن میں کوئی دُکھ پیدا ہو اول اُس کی پیٹ کا فساد ہے۔ لوگ پیٹ کی خبرگیری اچھی طرح نہیں کرتے اِس وجہ سے بیمار ہوتے ہیں۔ اگر نقصان کرنے والی کوئی چیز کھالو تو اُس کا نقصان فوراً معلوم نہیں ہوگا۔ اِس دھوکے میں لوگ پڑتے ہیں لیکن زندگی کی اصل پیٹ ہے۔ کھانا پانی اوّل پیٹ میں جاتا اور وہاں سے ہضم ہوتا

یعنی پکتا اور گلتا ہے۔ اور اُس کا عمدہ عرق جگر میں جاکر خُون بنتا ہے۔ اور کچھ ک انتڑیوں کی راہ نکل جاتا ہے۔ خون جو جگر میں بنتا ہے اُس کے ساتھ۔ بلغم۔ سودا۔ صفرا پیدا ہوتا ہے۔ بلغم ادھ کچرا خُون ہوتا ہے سودا تلچھٹ جو تہ میں جل کر پینِدے بیٹھ جاتا ہے۔ اور صفرا اُبال جو جوش کھاکر اوپر آجاتا ہے۔ یہ چار چیزیں خون۔ بلغم۔ سودا۔ صفرا۔ چار خلط بولے جاتے ہیں۔ جب اِن میں سے کسی کو حد سے بڑھکر زیادتی ہوئی یا اِن میں فساد ہوا بیماری پیدا ہوگئی۔ خون کی زیادتی اور فساد سے پھوڑا۔ پھنسی۔ نکسیر کھیلی ہوتی ہے۔ بلغم سے کھانسی زکام وغیرہ۔ صفرا سے تپ اور تپ سے درد سر وغیرہ۔ سودا سے خفقان مراق وغیرہ۔ پانی بھی پیپ بن جاتا ہے۔ لیکن اِس کا فضلہ جگر سے ہوکر گُردوں کی راہ سے مثانے میں پیشاب بنکر نکلتا ہے۔ پس غذا میں احتیاط کرنا واسطے حفظ صحّت کے ضرور ہے بھُوک سے زیادہ مت کھاؤ۔ کھانے کے وقت مت پیو۔ بلکہ مقرّر کر رکھو جب تک بھُوک خوب نہ معلوم ہو کھانے کا قصد مت کرو۔ ذرا سی گرانی معدے میں ہو تو فاقہ کرو۔ بے وقت کوئی نعمت مت کھاؤ اناپ شناپ پیٹ میں کھانا ٹھونسنا بیماری ہے۔

جو کھانا اچھی طرح ہضم نہیں ہونے پاتا اُس سے ناقص درجے کا بلغم پیدا ہوتا ہے۔ اور طرح طرح کی بیماریاں آکر گھیرتی ہیں لڑکے اِسی واسطے جلد۔ جلد بیمار ہوا کرتے ہیں کہ کھانے میں احتیاط نہیں کرتے۔ دن بھر بکری کی طرح اُن کا مُنہ چلتا ہے۔ دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو جانتے ہیں کہ توشک پر بیٹھے ہیں۔ اِسی پر سوئینگے۔ اُٹھنے کا

نام نہیں لیتے۔ کھٹی ڈکاریں آتی ہیں اور ڈکار کے ساتھ کھانا مُنہ میں آجاتا ہے اور کھاتے جاتے ہیں۔ ابھی پیٹ بھر کے اُٹھے ہیں اور پھر آموجود ہوئے۔ روٹی۔ سنگھاڑے۔ ککڑی۔ جھربیری کے بیر۔ پھلیاں چنے بلا بدتر جو مِلا سب چٹ۔ پھر بیمار نہوں تو تعجب۔ اور جب بیمار پڑتے ہیں تو مُصیبت ہے کہ نہ دوا پیتے ہیں اور نہ لگاتے ہیں۔ رونا ہے اور ہائے ہائے کرنا۔ اور خُوب سمجھ رکھو کہ جب بیماری آچکی تو بے دوا کیے نہیں ٹلتی۔

پس اگر خدانخواستہ بیمار ہو جاؤ فوراً دوا شروع کردو۔ اور دل کو مضبوط کر آنکھ میچ پی جاؤ۔ سب کہینگے واہ وا۔ شاباش۔ بھائی کیا اچھا بیٹا ہے۔ پھر تم کو مُنہ میٹھا کرنے کو مصری ملیگی۔ پان۔ ملیگا۔ جس سے مُنہ لال لال ہو جائیگا۔ اور جو دوا خوشی سے نہ پیوگے تو آخر پچھاڑے جاؤگے۔ کوئی چمچہ مُنہ میں دیگا۔ کوئی ڈوئی لے کر دوڑیگا۔ کوئی پنکھے کی ڈنڈی لائیگا۔ اِس خرابی سے دوا پی تو کیا۔ دوا کی دوا پی اور ناحق بُرے بنے۔ پھر مصری کہاں اور پان کیسا رونے کو الگ بٹھا دیا۔ آخر جھک مار چپ ہو رہوگے۔ جتنی ضد تم دوا پینے میں کروگے بیماری بڑھتی جائیگی۔ اور ایک دن کی جگہ شاید ایک مہینہ دوا پینی پڑیگی۔ دوا کے ساتھ پرہیز بھی ضرور ہے جو کھانا نقصان کرتا ہے تم تو نہیں سمجھتے۔ پس جس چیز کو منع کریں ہرگز مت کھاؤ۔ ورنہ جو دوا نے نفع کیا وہ بد پرہیزی نے سب باطل کر دیا۔ ناحق دوا کے دام بھی اکارت گئے اور تم نے بے فائدہ اُس کے استعمال کی تکلیف بھی اُٹھائی۔ جب اچھے ہو جاؤگے

تو اِس کے بدلے کی خُوب خُوب چیزیں تم کو ملینگی۔ کھاؤگے اور کہوگے آہا کیا مزے کا قلاقند ہے کیسی میٹھی لوزات ہیں۔

ہر ایک آدمی کو تھوڑی ریاضت اور محنت بھی ضرور ہے۔ تاکہ کھانا خوب ہضم ہو۔ سو تم دن بھر دوڑتے ہو ریاضت کافی ہے۔ لیکن کھانے کے بعد تھوڑی دیر آہستہ آہستہ ٹہلنا بھی ضرور ہے تاکہ کھانا خوب اُتر جاے۔ گرمی کے دنوں میں دھوپ کے وقت باہر پھرنا گویا زبردستی بخار کو بلانا ہے۔ جب دھوپ تیز ہونی شروع ہو اور سموم "جس کو لُو بولتے ہیں" چلنے لگے مکان کے اندر محفوظ جگہ میں بیٹھے رہو۔

بدبُو اور دُھواں۔ اور گرد۔ اور نمی۔ اور بند ہوا پانچ چیزیں تندرستی کے لئے زہر ہیں۔ پس بدبُو کے پاس صرف بقدر ضرورت رہنے کا مُضائقہ نہیں باقی اُس سے الگ رہنا چاہئے۔ اِسی طرح دھواں بھی ضرر کرتا ہے۔ اور گرد و غُبار بھی موجب نقصان ہے۔ نمی بہت بُری چیز ہے۔ بھیگا ہوا کپڑا اوڑھے رہنا یا بھیگے یا سیلے ہوئے مکان میں بیٹھنا ضرور بیماری کا باعث ہوتا ہے۔ شبنم یعنی اُوس اِس لئے مُضر ہے کہ اُس سے کپڑے سیلتے ہیں۔ چھڑکاؤ کُھلی ہوئی جگہ میں مضائقہ نہیں جیسے صحن یا کُھلی ہوئی چھت۔ لیکن بند کوٹھری میں چھڑکاؤ مت ہونے دو۔ دیکھو کیسی بھبک چھڑکاؤ کے بعد اُٹھتی ہے اگر مکان کُھلا ہوتا ہے تو بخارات نکل جاتے ہیں لیکن بند مکان میں گُھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ پس اِن بخارات کے ملنے سے ہَوا خراب اور زہریلی ہو جاتی ہے۔ برسات کے دنوں میں نمی کا بچاؤ مشکل سے ہوتا ہے

جو مکان ٹپکتا ہو اور جس کی زمین نم ہو اُس میں رہنا اچھا نہیں۔ اور جب دُھوپ نکلے بلاضرورت بھی سب کپڑے خشک کرانے چاہئیں۔ کیونکہ برسات کی ہوا بھی مرطوب ہوتی ہے۔ اندر رکھے ہوئے کپڑے بھی سیلے جاتے ہیں۔ نہانے کے بعد فوراً تمام بدن کو کپڑے سے خشک کرلو۔ اور وہ کپڑا الگ کردو۔ سب سے بہتر بالاخانے پر رہنا ہے۔ لیکن اگر بالاخانہ مکان میں نہ ہو تو کھلے ہوئے دالان میں۔ کوٹھری جس میں اسباب بند ہے اُس میں مت جاؤ۔ اُس کے اندر کی ہوا اچھی نہیں ہوتی۔

برتنوں کا دھوون کبھی مکان میں نہ ڈالا جائے۔ علیحدہ دُور پھینکدیا جائے۔ اس سے بھی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ ترکاری کے چھلکے مکان میں نہ پڑے رہیں۔ ان میں بھی ایک قسم کا زہر ہوتا ہے۔ اور گھر میں کوڑا جمع رہنا بھی بہت بُرا ہے۔ ایک عادت نہایت درجہ بُری ہے۔ وہ یہ کہ گرمی کے دنوں میں رات کو تو اوس میں سوئے اور آخر شب جب ہوا خنک ہوتی ہے تو سردی کے بچاؤ کے لئے اندر مکان میں جا پڑے۔ رات کی اوس اور صبح کی بند ہوا دونوں زہر۔ شام کے وقت بڑے شہروں میں ہمیشہ نہایت درجہ خراب وقت ہوتا ہے۔ اپنی ضرورتوں کے واسطے بکثرت لوگ بازاروں کو آتے جاتے۔ اُن کی آمد و شد سے غبار بلند ہوتا ہے اور دھواں لوشٹ سے غث خدا کی پناہ ایسا کہ سانس لینا مشکل ہوتا ہے اگر تم کو شک ہو تو بعد مغرب ذرا چوک تک جاؤ دیکھو گھر لوٹ کر آؤ گے تو سارے دھوئیں کے ناک سے الگ پانی بہتا ہے۔ آنکھوں

میں مرچیں لگ رہی ہیں۔ گویا دوزخ سے بھرے۔ ایسے وقت شہر کے باہر ہوا سرد میدان صاف نہ دھواں نہ گرد۔ انگریز لوگ ہوا خوری کو گھوڑوں اور بگھیوں پر سوار یا پیادہ نکل جاتے ہیں۔

صبح کی ہوا ہر موسم میں نہایت عمدہ صحت بخش روح افزا ہوتی ہے خصوصاً گرمی کے دنوں میں لیکن ہندوستانی گھر گھسنے صبح و شام دونوں وقت اس نعمت خداداد سے محروم۔ اسی واسطے جسے دیکھو پیٹ پکڑے پھرتا ہے ماش کے دو دانے کھاتے ہیں تو بدہضمی ہوتی ہے بیسن کی پکوڑی چکھ لیتے ہیں تو نفخ ہوتا ہے۔ تیل کی کوئی چیز زبان پر رکھتے ہیں تو چھاتی جلتی ہے کوئی ثقیل چیز کھا جاتے ہیں تو درد ہوتا ہے۔ اگر چلنے پھرنے کی عادت ہو صبح و شام ایک گھنٹہ بھی جنگل کی ہوا کھائیں تو سنو دوا کی ایک دوا ہے۔ انگریزوں کو تم نے دیکھا ہوگا کیسے توانا و قوی ہوتے ہیں بچے دیکھو تو معلوم ہوں دس برس کے اور ہیں صرف پانچ برس کے یہ سب بدولت ہوا خوری اور محنت کے ہے۔ چلنے پھرنے سے عرق آتا ہے۔ اور جتنی رطوبت ناقص ہوتی ہے سب پسینے کی راہ نکل جاتی ہے۔ کھل کر بھوک لگتی ہے۔ کھل کر اجابت ہوتی ہے۔ ہندوستانی لوگ جنھوں نے محنت کا فائدہ سمجھا۔ اور ہوا خوری کو انگریزی رسم قرار دیا ہے۔ انھوں نے اور تدبیر نکالی۔ کوئی ڈنڈ پیلتا ہے۔ کوئی مگدر یا لیزم ہلاتا ہے۔ کوئی کشتی لڑتا ہے۔ کوئی بیٹھکیں لگاتا ہے یہ بات بھی نفع سے خالی نہیں۔ دیکھو ڈنڈ پیل آدمی کیسے موٹے تازے ہوتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی ریاضت اکثر ذیلو تج

پیدا کرلیا ہے۔ اکھاڑے بنا رکھے ہیں اُن میں تمام دنیا کے بد وضع لڑکے جمع ہوتے ہیں۔ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ ریاضت ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن صبح و شام پیادہ پا ہوا خوری سے بہتر کوئی اور ریاضت نہیں ہے۔ اگر تم ریاضت کو پسند کرو تو آسان نسخہ ہمیشہ تندرست رہنے کا یہ ہے کہ ہر وقت تھوڑی بھوک لگی رکھو خدا نے چاہا تو کبھی بیمار نہ پڑو گے۔ (مولوی نذیر احمد دہلوی)

سوالات

۱- بیماری کے نقصانات بیان کرو؟

۲- بیماری کیونکر پیدا ہوتی ہے؟

۳- غذا جو ہم کھاتے ہیں وہ پیٹ میں جا کر کن کن صورتوں میں تبدیل ہو جاتی ہے؟

۴- لڑکے جلد جلد بیمار کیوں پڑ جایا کرتے ہیں؟

۵- اگر آدمی بیمار ہو جائے تو اُس کو کن کن ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔

۶- تھوڑی ریاضت کے فوائد تحریر کرو؟

۷- کونسی پانچ چیزیں تندرستی کے لئے زہر ہیں؟

۸- مکان کی صفائی کے متعلق کیا کیا باتیں قابل لحاظ ہیں؟

۹- گرمی کے دنوں میں صبح کی ہوا کیوں مفید خیال کی گئی ہے اور ہم ہندوستانیوں کا طریق عمل اِس کے برعکس کیا ہے؟

۱۰- انگریز اور اُن کے بچے ہندوستانیوں اور اُن کے بچوں سے کیوں توانا و تندرست زیادہ ہوتے ہیں؟

۱۱- تندرستی کا سب سے آسان نسخہ کیا ہے؟

دوست نما دشمن

ہم دشمنوں سے ڈرتے ہیں اور دوستوں پر بھروسا کرتے ہیں۔ دشمن ہمارے دل کو پریشان و غیر مطمئن رکھتے ہیں۔ اور دوست ہمارے دل بیقرار کو تسلی دیتے ہیں۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ دشمنوں

سے دُنیا خالی ہوتی اور دُنیا میں جتنے ہوتے دوست ہی دوست ہوتے لیکن یہ ہماری غلطی ہے۔ کیونکہ دوست دُشمن دونوں ہمارے لیے خدا کی برکتیں ہیں دُشمنوں سے ہم کو اپنی حفاظت اور حزم واحتیاط کا سبق ملتا ہے اور دوستوں سے ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے۔ سچ پوچھو تو دوستوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور دُنیا دُشمنوں سے آباد ہے اگر کشمکش زندگی کے مسئلے پر غور کیا جائے تو بخوبی نظر آجاتا ہے کہ دُنیا میں جو ہے اِسی فکر میں لگا ہوا ہے کہ ہمیں مٹا دے انسان اور درندے ہی نہیں یہ کیڑے مکوڑے اور یہ حجر و شجر سب ہمارے غارت کرنے کی فکر میں ہیں۔ مگر اِن کی طرح طرح کی دُشمنیوں ہی کو دیکھ کے ہم اپنی زندگی بناتے اپنے جینے کا سامان کرتے اور اپنی عمر بڑھاتے ہیں۔

لیکن خطرناک دُشمن وہ ہے جو دوست کی صورت میں آئے اور دوستی کا لباس پہن کے ہمارے ساتھ دُشمنی کرے۔ انسانوں میں ایسے بہادر کثرت سے ملینگے جو اپنے دُشمنوں پر غالب آئے ہوں۔ اور جس نے بہادری اور ہمت سے کام لیا کبھی دُشمن سے مغلوب نہیں ہوا۔ مگر وہ دُشمن جو دوست بنکر کے آتا ہے غالب ہی آتا ہے۔ جیسے بڑے بہادر ایسے ہی دُشمنوں کے ہاتھ سے مارے گئے ہیں اور زبردست سے زبردست سُورماؤں کو ایسے ہی دُشمنوں نے نیچا دکھایا ہے۔

دُنیا کی تاریخ پر نظر ڈالو تو معلوم ہو جائیگا کہ دُنیا کے بڑے بڑے نامی گرامی بہادر اور فتحمند شہنشاہ ایسے ہی دُشمنوں کے ہاتھ سے

مارے گئے ہیں۔ سکندر اعظم کے حملے کے وقت دارے عجم ایسے ہی دوست نما دشمنوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ لہٰذا عقلمند وہ ہے کہ دوست نما دشمنوں سے ہمیشہ چوکنّا رہے۔

(صدیق احمد لکھنوی)

سوالات

۱۔ ہم دشمنوں کی دشمنی سے کیوں ڈرتے ہیں اور دوستوں پر کیوں بھروسا کرتے ہیں؟
۲۔ جب ہمارے دوست کم اور دشمن زیادہ ہیں تو ہم کس طرح زندہ رہتے ہیں؟
۳۔ خطرناک دشمن کی کیا پہچان ہے۔ اور اس پر غالب رہنے کی کیا تدابیر ہیں؟
۴۔ دارا کا کیا نتیجہ ہوا۔ اس سے کیا نصیحت حاصل ہوتی ہے؟

حیاتِ انسانی

بچپن۔ اللہ اللہ بچپن کا زمانہ بھی کیا ہی بادشاہی وقت ہوتا ہے کہ اس میں نہ روٹی کا غم نہ کمانے کی فکر نہ گھربار کا جھگڑا نہ بال بچوں کا بکھیڑا۔ جب بھوک لگی رو دئے۔ پیٹ بھرا بنس پڑے اگر ہم ذرا دوڑتے تو ماں کو یہ خیال ہوتا کہ کہیں بچہ گر نہ پڑے اس کے چوٹ نہ آجائے۔ مگر ہمیں اس کی سمجھ بھی پیدا نہ تھی۔ آگ پر ہم ہاتھ ڈال دیتے۔ سانپ کو ہم پکڑ لیتے اور اس سے کھیلنے کھڑے ہو جاتے۔ اور پر خدا نیچے ماں باپ ہمارے محافظ تھے۔ گویا ہمارے جینے کا فکر بھی ہمارے ماں باپ کو ملا تھا۔ حاکم کے روبرو ہم بے قصور ٹھہرتے تھے۔ خدا کے نزدیک ہم معصوم خیال کیے جاتے تھے۔ ظالم بھی دیکھتا تو ہم سے ہنس کر بولتا۔ غرض ہر شخص ہمیں گود میں اٹھا لیتا۔ جب ذرا بڑے لڑکوں میں شمار ہوئے تو کھیلنے کودنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ بے فکری سے ماں باپ کی روٹیاں توڑنا

آنسوؤں پر ہنسنا کھیلنا۔ کسی سے دھول۔ کسی سے دھپا۔ ہونے
کا غم نہ جینے کی خوشی۔ رونے کے موقع پر ہنسنا۔ کھیلنا۔ ہنسنے کے
موقع پر رونا۔ ہر بات کی اُمنگ۔ ہر بات کی چاہ ہمارا شیوہ تھا اب
وہی ہم ہیں کہ طرح طرح کے صدمے اُٹھا رہے ہیں۔ حاکم کا ہمیں
خوف ہے۔ خدا کے گھر کا ہمیں ڈر۔ کاش ہم اُسی عمر کے رہتے
تو کیا اچھا ہوتا۔

جوانی کا عالم بھی عجب عالم ہے۔ اس میں پانی دودھ ہو کر
لگتا ہے۔ اور روکھی روٹی گھی کا کام دیتی ہے۔ جوانی کی نیند عجب
نیند ہے پر کیسے آرے چلیں مگر خبر تک نہیں ہوتی۔ اِس نیند کا
متوالا ہر وقت سرشار بنا رہتا ہے بات بھی کرتا تو اس کڑاکے سے
کہ دل ہل جائے۔ قدم بھی رکھتا ہے تو اِس زور سے کہ زمین
ہل جائے۔ اِن دنوں میں سارے قویٰ۔ تمام اعضا زوروں پر ہوتے
ہیں رگوں میں خون اِس طرح دوڑا دوڑا پھرتا ہے جس طرح بچے کبڈی
کھیلتے ہیں۔ دلوں میں طرح طرح کے ولولے اِس طرح جوش مارتے
ہیں جیسے فوارہ اُچھلتا ہے۔ جو بات آتی ہے رو کی طرح آتی ہے
نزلے کا دم بند۔ زکام کا دم خشک۔ بلغم کا منہ فق رہتا ہے۔ بڑھاپے کی
شکایت۔ نہ چوٹ کی حکایت۔ اندھیرے کا خوف نہ اُجالے کی خوشی
شیر کی دہشت نہ تنہائی کی دہشت۔ بھرا بھرا بدن۔ کام سے
تھکنا نہ کسی سے جھکنا۔ یہ سارا اسی عمر کی طفیل ہے۔ یہ ایسا
زمانہ ہے کہ انسان خواہ کیسا ہی سخت کام ہو نہایت آسانی
سے کر سکتا ہے۔ اِس لیے اِس زمانے کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔

ادھیڑپن۔ جب جوانی کا زمانہ رخصت ہو جاتا ہے تو آدمی
اپنے دل ہی دل میں خیال کرتا ہے کہ ہائے بچپن کا زمانہ جسے
بادشاہی وقت کہتے ہیں وہ جاتا رہا۔ لڑکپن ہمارا گذر گیا۔ جوانی کی
لن ترانی ہماری مٹ گئی۔ ہم ادھیڑپن میں پڑے ہیں۔ شکر ہے
کہ گو آدھا سر سفید ہو گیا۔ دانت ہلنے لگے۔ کمر میں درد دل سرد
رہنے لگا۔ مگر آدمیت سے تو خارج نہیں ہوئے کوئی ہمیں ستر ابھترا
بوڑھا تو نہیں کہتا۔ اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے سے محتاج نہیں ہوئے۔
چل پھر کر دو چار پیسے بھی کما لاتے ہیں۔ صلاح۔ مشورہ دینے کو
کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جوان کو دھمکا بھی دیتے ہیں۔ کہ تم نے
ابھی دیکھا کیا ہے۔ ہماری سی مصیبتیں اٹھاؤ گے تو جانو گے۔
بڑھاپا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ انسان اپنی عمر کے تمام مدارج طے
کر چکتا ہے۔ دانت گرنے لگ جاتے ہیں۔ بال گالا ہو جاتے ہیں۔
چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ ہڈی سے چمڑا لگ جاتا ہے۔ گوشت
گھل جاتا ہے۔ گردن ہلنے لگتی ہے۔ کان جواب دے دیتے ہیں
آنکھوں سے لاچار ہو جاتا ہے۔ ہاتھ کانپنے لگتے ہیں پیٹھ کبڑی ہو جاتی
ہے۔ لکڑی کا سہارا لگتا ہے۔ اس وقت خیال کرتا ہے کہ ہائے
افسوس۔ اب ہم ستر بہترے ہو گئے۔ بوڑھا ببک ہمارا نام ہوا
لڑکے ہماری نقلیں اتارتے ہیں۔ جوان ہم پر ہنستے ہیں کا
کھانا ہمیں ہضم نہیں ہوتا۔ کمانے کے ہم نہیں۔ عبادت کے
ہم نہیں۔ ہاتھ اٹھائی روٹی ہم کھاتے ہیں۔ افسوس نہ یادِ
الٰہی کر سکے نہ دنیا کے کام بنا سکے ؎

تھیں چند اپنے ذمّے دھر چلے کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے

مبارک ہیں وہ لوگ جو وقت کی قدر کرتے ہیں۔ بچپن۔ جوانی
ادھیڑپن۔ بڑھاپے میں نیکی کی راہ نہیں چھوڑتے۔ دنیا میں اچھی
گذارتے ہیں اور اپنی عاقبت بھی سنوارتے ہیں۔ (سید احمد دہلوی)

سوالات

۱- انسان۔ بچپن۔ جوانی۔ ادھیڑپن اور بڑھاپے میں کیا کیا کام کرتا ہے اور کس طرح اپنے ان اوقات کو گذارتا ہے؟

۲- تم کن لوگوں کو مبارک سمجھتے ہو؟

اوقات کی پابندی

اوقات کا انضباط کاروبار کے پورا کرنے کی جان ہے۔ جس کام کے لیے جو وقت مناسب ہو اُس وقت اُس کو کرنا چاہئے۔ کام میں مستعد اور پابند اوقات ہونے کی محرک وقت کی قدر شناسی ہوتی ہے کارگذار آدمی تو وقت سے زیادہ کسی چیز کو بیش قیمت نہیں جانتے وہ اپنے ایک ایک گھنٹے اور ایک لمحہ کے لیے کام مقرر کرتے ہیں۔ جس کام کا وقت آجاتا ہے اُس کام کے کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور اِس بات کو وہ کاروبار کے پورا ہونے کی اصل سمجھتے ہیں۔ جن پیشوں میں کام مشکل اور پیچیدہ ہوتے ہیں جیسے سوداگری وکالت۔ بیرسٹری۔ طبابت۔ ڈاکٹری وغیرہ اِن میں کوئی شخص سرفراز اور ممتاز بغیر پابندی اوقات نہیں ہوسکتا۔ سوداگر وقت پر روپیہ نہ ادا کرے تو دیوالہ نکلتا ہے۔ بیرسٹر۔ وکیل مقدمہ کی پیشی کے وقت نہ حاضر ہو تو مقدمہ خارج ہوتا ہے۔ طبیب۔ ڈاکٹر

وقت پر مریض کی خبر نہ لے تو وہ قریب المرگ ہوتا ہے۔
وقت کو اچھی طرح استعمال میں لانے سے آدمی اپنی تہذیب۔ تعلیم ترقی اخلاق کرسکتا ہے اگر آدمی چند سال تک ہر روز ایک گھنٹہ اپنی تہذیب و ترقی کے اندر خرچ کیا کرے تو وہ جاہل سے عالم، نادان سے دانا ہو جائے یا اُس گھنٹے کو یادِ خُدا میں صرف کیا کرے تو اچھے کاموں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ آخرت کے لیے موت کے وقت اُس کے ہاتھ لگ جائیگا۔
وقت کی پابندی بادشاہوں کی نیک اطواری اور شائستگی اور شریفوں کے فرائض اور کام کرنے والوں کے ضروریات میں داخل ہے جو شخص کسی کام کرنے کا وعدہ کسی وقت معین پر کرتا ہے اور اُس کو پورا کرتا ہے تو اُس سے اُس کا لوگوں میں ایسا اعتبار بڑھتا ہے کہ کسی اور شے سے نہیں بڑھتا۔ (مولوی عنایت اللہ دہلوی)

سوالات

۱۔ کارگزار آدمی کسی چیز کو وقت سے زیادہ قیمتی کیوں نہیں سمجھتے؟
۲۔ مشکل اور پیچیدہ کاموں کے پیشوں میں پابندی اوقات کیوں ضروری ہے؟
۳۔ اگر آدمی اپنی تہذیب میں ہر روز ایک گھنٹہ صرف کیا کرے تو کیا نتیجہ ہوسکتا ہے؟
۴۔ وقت کی پابندی سے کیا فوائد مترتب ہوسکتے ہیں؟

ادب

ادب کے معنی اُس ریاضت محمودہ اور کوشش و سعی کے ہیں جس سے کسب فضیلت ہو۔ ہر چیز کی حد کی نگہداشت اور ہر فعل محمود کی تعلیم کو بھی ادب کہتے ہیں۔ تو اپنے نفس کو وہ ادب

سکھا کہ بے ادب اُسے دیکھکر باادب ہو جائیں۔ جو ادب سکھانے کا ذوق رکھتا ہے وہ بے ادبوں کو اپنا ہی سا بنا لیتا ہے۔ جیسے آہوئے وحشی جو گھر میں دانہ کھاتا ہے وہ اور آہوؤں کو پکڑ لاتا ہے۔ جو اپنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے اُس کا فکر اُستاد ہو جاتا ہے بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے۔ تو لالہ و گل کی طرح تھوڑا خندہ کر کہ سب کو مطبوع ہو۔ نہ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں۔ بے خرد جس کو مزاح کہتے ہیں وہ خردمند کے نزدیک نبرد و سلاح ہے۔ اگر تمھاری ڈاڑھی کوّے کے پروں کی سی سیاہ ہو تو بڈھوں کی بگلا سی سفید ڈاڑھی پر ہنسی نہ اڑاؤ اگر تم سمن عارض اور گلعذار ہو تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھکر اُسے نہ چڑھاؤ کیونکہ کوئی بدصورت دُنیا میں بے مصلحت نہیں ہوتا۔ ایک چینی جس کا رنگ سُرخ و سفید تھا ایک زنگی پر ہنسا تو زنگی نے جواب دیا کہ میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لئے زیب ہے۔ اور تیرا ایک نقطہ میرے لئے ایک عیب ہے۔ تجھے چاہئے۔ کہ جو تیرا عیب بیں ہو تو اُس کا ہنر دیکھ۔ جو تجھے زہر دے تو اُس کو نبات دے۔ جو تجھے مارے تو اُسے آبِحیات دے تاکہ تیری عقل سلامت پسند ہو اور تیرے نام کا خطبہ اخلاق میں بآوازِ بلند پڑھا جائے خدا سے توفیق ادب کی دُعا مانگ۔ کیونکہ ادب کے بغیر لطفِ رب سے آدمی محروم رہتا ہے۔ بے ادب اپنے ہی لیے بُرا نہیں ہوتا بلکہ اوروں کے لئے بھی بُرا نمونہ ہوتا ہے۔ ادب انسان کو معصوم بناتا ہے۔ گستاخی اور بیباکی غموں کا ہجوم رکھتی ہے۔

(مولوی ذکاءاللہ)

سوالات

۱- ادب کی تعریف کرو؟
۲- ادب سکھلانے والا دوسروں کو کس طرح باادب بنا سکتا ہے اُس کی تمثیل دو؟
۳- ایک چینی جب زرگی پر ہنسا تھا تو اُسے زرگی نے کیا جواب دیا تھا اور اُس سے کیا نصیحت نکلتی ہے؟

ابر و باراں

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نخوری

دُنیا میں انسان کے لیے کوئی نعمت و رحمتِ الٰہی ابر و باراں کے برابر نہیں خدا کی قدرت اس میں اپنے عجیب عجیب جلوے دکھاتی ہے۔ سمندر سے ابر تیرہ پانی سے پُر ہو کر اُٹھتا ہے۔ اپنے ایک ٹکڑے سے مہر نور افشاں پر کالی نقاب ڈال دیتا ہے کہ اُس میں سے اپنے چہرے کو نہیں دکھا سکتا۔ ماہ و انجم تاباں کو پردۂ ظلمت میں لے آتا ہے اُن کے نورانی چہروں کی جگہ کالے دیو نظر آتے ہیں۔ بادلوں ہی کے فیض سے زمین پر ساری چیزیں اُگتی اور بڑھتی ہیں جن سے کہ انسان حیوان نباتات پلتے ہیں اگر وہ یہ فیض رسانی نہ کریں تو پھر انسان کی جان پر آبنتی ہے۔ شاید ابتدائی نظر میں دکھائی دیتا ہے کہ آسمان کی بڑی رونق یہی ہے کہ اُس پر بادل کلموے نہ چھائے ہوئے ہوں۔ جس کے سبب سے اُس سے اوپر سارے چہرے تاباں و درخشاں نظر آئیں۔ لیکن یہ خیال سچا نہیں۔ بلکہ آسمان کے حُسن کی بہار یہ بادل ہی دکھاتے ہیں۔ آسمان پر بادلوں کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ زمین پر آدمیوں کا۔ اگر زمین پر آدمی نہوں تو وہ ویران ہے

ایسے ہی آسمان پر اگر بادل نہوں تو وہ سنسان ہے نہ بادل کی گرج ہے نہ بجلی کی کڑک ہے۔ آسمان کی آبادی بادلوں ہی سے ہے اس میں وہ رہتے ہیں۔ اپنی اٹکھیلی چالوں سے چلتے ہیں کبھی اِدھر دوڑ گئے کبھی اُدھر۔ عورتوں مردوں کی طرح یہ کبھی لباس بدلتے ہیں۔ قوس و قزح کے رنگ دکھاتے ہیں۔ عجب عجب چہرے بناتے ہیں۔ کبھی گریاں ہوتے ہیں کبھی خنداں۔ کبھی وہ ڈراونی آوازیں لگاتے ہیں۔ کہ دل دہلنے لگتا ہے کبھی بجلی کو چمکاکے پانی میں آگ کا تماشا دکھاتے ہیں۔ غرض اِن کی وہ ساری حرکتیں آسمان پر ہوتی ہیں جو زمین پر آدمیوں کی۔ آسمان بادلوں سے کھیل کر ہماری خاک سیراب کرتا ہے۔ اور اُس کے پیوستہ ڈھیلوں کو ریزہ ریزہ کرتا ہے۔ خدائے تعالےٰ نے انسان کا رزق اِن بادلوں کے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اسی لیے انسان کے اغراض اُن بادلوں سے ایسے وابستہ ہیں کہ اُس نے ابتدائے دُنیا سے جستجو و تگاپو کی کہ بادلوں کا بنانا اور اُن سے مینھ کا برسانا اُس کے قبضۂ اختیار میں آجائے مگر تجربوں اور مشاہدوں نے اُس کو یقین دلا دیا ہے کہ یہ باری تعالےٰ قدرت بشری سے ہمیشہ باہر رہے گی۔ (ذکاءاللہ)

سوالات

۱۔ شعر کا مطلب تحریر کرو؟

۲۔ ابر و باراں کو خدا کی تمام نعمتوں سے کیوں ترجیح دی گئی ہے؟

۳۔ ثابت کرو کہ آسمان پر بادلوں کا وہی حال ہے جو زمین پر آدمیوں کا؟

۴۔ انسان کا رزق بادلوں سے کیوں وابستہ ہے؟

زراعت وحرفت

ہندوستان اِس رو سے بڑا ہی خوش نصیب مُلک ہے کہ اس میں پانی کی افراط ہے۔ مٹی قابلِ زراعت ہے۔ موسم مناسب ہیں غرض ہندوستان میں غلّہ کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور اسی سے یہ مُلک زرخیز اور سیر حاصل کہلاتا ہے۔ جس کو خدا اِس مُلک کی سلطنت دے مالگذاری کی وجہ سے اُس کا خزانہ ہمیشہ بھرپور رہتا ہے۔ بایں ہمہ کال کا بھی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ برسات نہیں ہوتی تو زمینیں جوتی بوئی نہیں جاتیں۔ مگر اتنا شکر ہے کہ ہندوستان میں عالمگیر قحط نہیں ہوتا اور متواتر کئی کئی برس کے لیے بھی نہیں ہوتا۔ اگر ایک حصّہ میں ہوا تو دوسرے حصّے اُس کو سنبھال لیتے ہیں۔ گرانی ہو جاتی ہے مگر حاکم کی طرف سے اچھا انتظام جیسا کہ اب ہوا کرتا ہے تو لوگ بھوکوں مرنے نہیں پاتے۔

دُنیا کی ساری ضرورتوں میں سب سے بڑی ضرورت پیٹ بھرنے کی ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ "نان نہیں تو جان نہیں" پس کاشتکاری کا پیشہ جو ایسی سخت ضرورت کو پورا کرتا ہے بڑا سود مند، نافع خلائق اور معزز پیشہ ہونا چاہیے۔

کاشتکاری میں بڑی خوبی اور بھلائی یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کاشتکاروں کے ذریعہ سے اپنے بندوں کو رزق پہنچاتا ہے جس کے وہ محتاج ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور فضیلت کیا ہو سکتی ہے کہ بندوں کا ایک گروہ خاص خدا کی شانِ رزاقی کے ظاہر ہونے کا ذریعہ ہے۔

مذہب اور اخلاق کی حیثیت سے دیکھا جائے تو دنیا میں کوئی پیشہ کاشتکاری سے بڑھ کر پاکیزہ اور کسبِ حلال طیّب نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ اِس میں جھوٹ۔ دغا۔ فریب۔ مکر۔ کسی بدی کی ترغیب نہیں۔ کاشتکار اگر ذرا احتیاط سے کام لے تو اُس کی زندگی بڑے امن کے ساتھ گذر سکتی ہے۔ اس کو اپنے خدا اور اپنے مویشیوں اور اپنے بال بچوں کے سوا ابنائے جنس میں سے کسی کے ساتھ تعلق رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ خدا اُس کو بے منّت غیرے سب سے بہتر روزی دیتا ہے۔ اُس کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ اُس کو خدا کی طرف سے غافل نہیں ہونے دیتا اور یہی وہ سچی دینداری ہے جو کسی دُنیادار کو نصیب نہیں ہوتی اِلّا ماشاء اللہ۔ تندرستی کے اعتبار سے مفرّحِ ذات۔ ممدِ حیات۔ منفاد کے اعتبار سے کثیر المنفعت۔ غرض جس جس پہلو سے دیکھا جاتا ہے کاشتکاری کے آگے کوئی کام خاطر تلے نہیں آتا۔ مگر نہایت افسوس کی بات ہے کہ جیسا یہ پیشہ فی نفسہٖ معزز تھا ویسا ہی لوگوں کے برتاؤ نے اُس کو ذلیل کر رکھا ہے۔ سبب کیا کہ قدیم الایام سے راجہ یا بادشاہ جو کوئی بھی وقت کا حاکم ہوا تمام زرعی زمین کا مالک متصوّر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ رُوئے زمین پر ہر جگہ حاکمِ وقت زمین کا مالک ہوا تو بیچارے کاشتکار اُس کے مقابلے میں ایسے ہو گئے جیسے مالکِ مکان کے ہاتھ تلے کرایہ دار۔ یہی وہ دستور تھا جس نے ہمیشہ کے لئے کاشتکاروں کا سارا زور توڑ دیا۔

اَب حال یہ ہے کہ زمین جوتے کاشتکار۔ اپنی گرہ کا بیج بوئے کاشتکار۔ گاہے کاشتکار۔ یعنی شروع سے آخر تک اپنا خون پسینہ ایک کرے کاشتکار۔ خدا خدا کرکے اناج تیار ہوا تو سرکار اپنا حصّہ لینے کو موجود اور حقیقت بھی ہن مانتا حصّہ کیونکہ حاکم اور محکوم کا ساجھا کیا۔ چھری خربوزے پر گرے تو خربوزے کا نقصان اور خربوزہ چھری پر گرے تو خربوزے کا نقصان یوں تو کاشتکاری کی سٹی خوار ہوئی۔ انگریزوں نے پھر بھی کاشتکاروں کے ساتھ بہت سی رعایتیں ملحوظ رکھی ہیں۔ مگر آئے دن اختیاری اضطراری ایسے بروگ آپڑتے ہیں کہ کاشتکار پنپنے نہیں پاتے۔

کاشتکاری ہی کی ایک شاخ ذرا اُس سے بہتر زمینداری ہے۔ بات یہ ہے کہ ملکیتِ آراضی کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو تحصیل خراج کا ہے۔ اس حق سے تو سرکار زمین کی مالک ہے۔ اور ایک پہلو زمین کے بیع ورہن کرنے کا ہے۔ یہ حق سرکار نے زمیندار کو دے رکھا ہے۔ یعنی زمین کی ملکیت میں دو شریک ہیں۔ سرکار اور زمیندار یہ زمیندار کا کام ہے کہ فصل پر سرکاری خراج کاشتکاروں سے وصول کرے اور اپنا حق زمینداری جو کچھ بھی سرکار سے مقرر ہے کاٹ کر بقیہ رقم سرکار میں پہونچائے۔ سرکاری خراج جو زمیندار کاشتکار سے لیتا ہے اُسی کو لگان کہتے ہیں۔ اور جو وہ اپنا حق رکھکر تحصیلدار کے ذریعے سے سرکار میں پہونچاتا ہے وہ مالگذاری ہے۔

دوسرا ذریعۂ معاش دستکاری ہے کہ وہ کاشتکاری کو تو نہیں پاتا
مگر ہے تو اس سے ملتا جلتا ہوا۔ کاشتکاری میں بھی آزادی ہے
پرائی تابعداری نہیں۔ فرق اگر ہے تو اسی قدر کہ کاشتکار زمین میں
تصرف کرتا ہے۔ دستکار زمین میں نہیں۔ لکڑی۔ لوہا۔ کپاس۔
کوئی خام چیز پکڑ لیتا ہے اور اسی کو اپنی ہنرمندی سے بکار آمد
بناتا ہے۔ کاشتکاری میں محنت بہت۔ دستکاری میں کاشتکاری
جیسی محنت نہیں مگر سلیقہ بہت۔ کاشتکاری میں جسمانی محنت دستکاری
میں دماغی۔ کاشتکاری میں ارضی و سماوی کتنی آفات کا خطرہ ہے۔
دستکاری ان سے محفوظ۔ کاشتکاری میں خدا کی قدرت کو بڑا دخل
ہے۔ دستکاری میں آدمی کی خداداد لیاقت کو۔ مٹی۔ پتھر۔ لوہا۔
لکڑی سب چیزیں خدا پیدا کرتا ہے۔ معمار۔ لوہار۔ بڑھئی اپنی اپنی
دستکاریوں سے ان چیزوں کو ترتیب دے کر عالیشان خوشنما
عمارت بنا کر کھڑی کرتے ہیں۔ ملکی دولت اوّل درجے میں اناج
دوسرے درجے میں دستکاری یہ دستکاری ہی تو ہے جس کی بدولت
یورپ کو آج سب طرح سے سہاگ لگ رہے ہیں دنیا کی دولت
دستکاری کے بدلے میں یورپ کھنچی جاتی ہے۔ کتنی چیزیں ہیں کہ
یورپ میں نہیں ہوتیں۔ خدا نے وہاں کی زمین میں ان چیزوں
کے پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں دی۔ تو اہل یورپ
دوسرے ملکوں کی پیداوار خام لیجا کر اپنے صرف میں لاتے یا
اپنی ہنرمندی سے اس کو بنا سنوار کر دوسرے ملک والوں کے
ہاتھ خاطر خواہ فائدے سے فروخت کرتے ہیں مثلاً روئی کہ کپاس

کی صورت میں ہے گئے۔ کانوں کے ذریعے سے اوٹا۔ تونا۔ کاتا بنایا اور طرح طرح کے خوشنما کپڑے تیار کر لیے جن کو ساری دنیا پہنتی ہے

(نذیر احمد دہلوی)

سوالات

۱۔ ہندوستان کیوں بڑا خوش نصیب ہے؟

۲۔ تمام ضرورتوں میں سب سے بڑی ضرورت انسان کے لیے کیا ہے؟

۳۔ کاشتکاری کی بڑی خوبی اور عمدگی کیا ہے؟

۴۔ مذہب اور اخلاق کے لحاظ سے کاشتکاری کو اور پیشوں پر کیوں فضیلت ہے؟

۵۔ تندرستی کے اعتبار سے زراعت کو دوسرے کاموں سے بہتر ثابت کرو؟

۶۔ کاشتکاروں کے ساتھ سلطنتِ انگریزی کا سلوک بہ نسبت قدیم سلطنتوں کے کیسا ہے؟

۷۔ زمین کے کے حصہ دار ہیں اور ان میں سے سب کو جدا جدا کیا کیا حقوق حاصل ہیں؟

۸۔ کاشتکاری کے بعد کس ذریعہ معاش کا نمبر ہے اور وہ کیسا ہے؟

۹۔ ملکی دولت کے کے درجے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تفصیل کرو؟

۱۰۔ اہلِ یورپ دیگر ممالک کی خام پیداوار سے کیونکر فائدہ اُٹھاتے ہیں؟

انگریزی حکومت کے برکات

برٹش عہد میں ہم نے اسٹیمروں کو دیکھا۔ اسٹیمروں نے انگلستان فرانس جرمن۔ امریکہ۔ چین۔ جاپان وغیرہ سے ہندوستان کو اتنا قریب کر دیا کہ اس سے پہلے یہ بات کبھی حاصل نہ تھی۔ یہ مغربی فرشتے ہمارے ملک کی پیداوار یورپ کو لے جاتے ہیں وہاں سے طرح طرح کی چیزیں ہمارے لیے لاتے ہیں۔

ہم پہلے گاڑی۔ چھکڑا۔ رتھ۔ بہل پر سفر کرتے تھے۔ اب ہر حصۂ ملک میں ریلوے کا جال پھیلا ہوا ہے۔ پہلے ایسی سواری راجاؤں اور بادشاہوں کو بھی نصیب نہ تھی جس پر اب غریب سے غریب

آدمی سفر کرتے ہیں۔ ریلوے کے ساتھ تار برقی نے ہم کو تمام دنیا سے قریب کر دیا ہے۔ گھر بیٹھے چند ساعت میں ہزاروں کوس کی خبریں روزانہ ہم کو ملتی ہیں۔ یہ وہ حیرت ناک ایجاد ہے جس سے ہماری عقلیں حیران ہیں۔

سررشتہ ڈاک کا ایسا اچھا انتظام ہے جس کا ہم کو دل سے شکر گزار ہونا چاہئے۔ اس سے پہلے مشرقی تاریخوں میں کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا جس میں ایک پیسے کا پوسٹ کارڈ پشاور سے کلکتہ اور ڈھاکہ تک جا کر تیسرے روز مل جاتا ہو۔

مغربی اسباب سے ہندوستان کے تمام بازار بھرے پڑے ہیں سوئی پیچک تک برٹش برکات کا نمونہ نظر آتی ہیں۔ بگی۔ فٹن۔ موٹر کار بائیسکل۔ ٹرائیسکل۔ فوٹو گراف۔ گراموفون۔ اور طرح طرح کی مشینیں وغیرہ کیسی کیسی عجیب چیزیں ہیں۔ جو اس وقت کی خصوصیت میں سمجھی جاسکتی ہیں۔

انگریزی قوانین کو بھی ہم ایک برکت جانتے ہیں جن کے ذریعہ سے ایک غریب آدمی بڑے بڑے زبردست کا مقابلہ کر سکتا ہے حتے کہ خود بادشاہ پر اپنے حق کا دعوے ہو سکتا ہے۔

اس عہد میں سڑکوں کی کثرت اور ہر جگہ حفاظت کے انتظام نے ایسا امن قائم کر دیا ہے کہ سیاح۔ مسافر۔ سوداگر بے کھٹکے دن رات راستہ چلتے ہیں۔ کوئی تکلیف یا نقصان نہیں اٹھاتے۔ نہروں کے سلسلے نے خاص وسعت پیدا کر دی ہے جس سے کاشتکاری کو بہت کچھ نفع ہے۔

انگریزی شفا خانوں نے پلیگ کی حفظِ صحت اور تندرستی میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ اور ڈاکٹری کی نئی نئی تحقیقاتوں نے ہم کو وہ وہ باتیں بتائیں اور ایسی ایسی اُستادیاں دکھائیں جو اعجازِ مسیحائی کا نمونہ ظاہر کرتی ہیں۔

پریس کی ترقیوں نے علمی دُنیا کو بے حد شُکر گزار کیا ہے جس کی وجہ سے تعلیم نے عام رواج پایا ہر شخص کو پوری آزادی ہے کہ کالجوں اور اسکولوں میں جاکر جو علم چاہے سیکھے بازاروں سے جس فن کی کتابیں چاہے خرید کرکے اپنے علم میں ترقی دے۔ اِس پر ہر قوم جائز فخر کرسکتی ہے۔ یہ اِس دور کی خصوصیات سے ہے۔

(مولانا امجد علی اشہری)

سوالات

۱۔ برٹش عہد میں ہمارے تعلقات دُنیا کے ممالکِ بعیدہ سے کس طرح ترقی کر گئے - اور اِس کا کیا نتیجہ ہوا؟

۲۔ ریلوے اور تار برقی کے فوائد قلمبند کرو؟

۳۔ ڈاک کے فائدے بتاؤ؟

۴۔ مغربی اسباب کے فوائد ہمارے لئے کیا کیا ہیں؟

۵۔ انگریزی قوانین کی برکتیں بیان کرو؟

۶۔ سڑکوں کی کثرت سے کیا کیا فائدے مترتب ہوئے ہیں؟

۷۔ نہروں، شفاخانوں اور پریس کی ترقیوں سے ہندوستان کو کیا کیا فائدے پہونچے؟

شادی و غم

دُنیا میں کوئی چیز اور کوئی جذبۂ انسانی ایسا نہیں ہے جس میں اسی قسم کی دو مخالف و متضاد کیفیتیں نہوں وہی صفت جو دوزخ و جنت۔ اعلیٰ و ادنےٰ لطیف و کثیف مزیدار و بے مزہ پُرلطف و بے لطف اور اچھے

اور بُرے میں ہے وہی اِن دونوں لفظوں میں ہے۔ دُنیا میں کوئی کیفیت اور کوئی حالت نہ ہوگی جو اِس قسم کی دو متقابل جہتوں اور ضدوں کی تابع نہ ہو۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر کیفیت اور ہر چیز میں یہ متضاد صورتیں محض اِس لئے پیدا کی گئی ہیں کہ بغیر اِس کے ایک دوسرے کا حُسن و قبح معلوم نہیں ہوسکتا۔ دن اِس لئے دن ہے کہ رات کے بعد ہے اور رات اس لئے رات ہے کہ دن کے بعد آتی ہے۔ پھر اِن دونوں کا باہمی مقابلہ ہر شخص کو اپنے خیال اور مذاق کے مطابق اِس امر کا فیصلہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے اور کون بُرا۔ اور یہی حالت اور نسبت اِسی طرح کی تمام کیفیتوں میں خیال کر لیجئے۔

فلسفیوں میں ایک نازک بحث پیدا ہوئی ہے کہ دُنیا میں خوشی زیادہ ہے۔ یا غم۔ مگر انصاف اور غور سے دیکھیے تو یہ بحث ایسی ہی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ دُنیا میں دن زیادہ ہے یا رات زیادہ ہے۔ اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو دونوں کے سرچشمے خدا نے یکساں درجے پر سیراب اور کبھی نہ خشک ہونے والے پیدا کیے ہیں۔ مگر ہاں یہ ہماری استعداد اور قابلیت کا نتیجہ ہے کہ اِن میں سے کس کو اور کس مقدار میں حاصل کرتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ ہمیں خوشی یا غم اِن دونوں میں سے جو چیز نصیب ہوتی ہے وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے نصیب ہوتی ہے اپنی زندگی کے حالات پر غور کرو اپنی ضرورتوں کو نکتہ چینی

کی نظر سے دیکھو۔ اور اس بات کا خیال کرو کہ جن چیزوں کی احتیاج و ضرورت کے ہم دعویدار ہیں اُن میں سے حقیقتاً کتنی ضروری ہیں اور کتنی غیر ضروری۔ دُنیاوی تکلّفات میں پڑکے تعلّقات کو بڑھاکے اور اپنے حوصلوں اور اپنی آرزوؤں کو فضول وسعت دیکے ہم نے اپنی یہ حالت بنالی ہے کہ ہوسوں کا دامن کسی وقت ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اور زندگی کی کوئی ایسی گھڑی نہیں ہوتی جس وقت ہم کسی ضرورت کو نہ محسوس کر رہے ہوں۔

(صدیق احمد لکھنوی)

سوالات

۱- ثابت کرو کہ دُنیا کی ہر چیز اور ہر جذبۂ انسانی میں شادی و غم کی آمد و متضاد کیفیتوں میں سے ایک ایک موجود رہتی ہے؟

۲- ہر چیز میں شادی و غم کی متضاد صورتیں کس غرض سے پیدا کی گئی ہیں؟

۳- فلسفیوں نے خوشی اور غم کے متعلق نازک بحث کیا پیدا کی ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہے؟

۴- ہم کو ہر وقت غم اور فکر میں گرفتار رکھنے والی کیا چیز ہے؟

دُنیا کی نعمتوں کی شکر گذاری

دُنیا میں ہزاروں مصائب ہیں۔ پس جس مصیبت سے تم بچو اُس پر خُدا کا شکر کرو۔ بیماریاں دیکھتے ہو کہ کتنی ہیں۔ کوئی تپ ہی کے مارے تڑپ رہا ہے۔ کوئی گٹھیا سے کھٹیا پر لٹک رہا ہے۔ کوئی ہاتھ پاؤں سے اپاہج پڑا ہے۔ پس جب تم تندرست اور امراض جسمانی میں مُبتلا نہو تو خُدا کا ہزار ہزار اور اگر امراض روحانی میں مبتلا نہو تو لاکھ لاکھ شکر تم کو کرنا چاہئے۔ کسی ایک مصیبت سے بچے رہنا خُدا کا ایک نیا فضل و کرم ہمارے حال پر ہے۔

بہت سے آدمی کھاتے پیتے ہیں۔ چین سے رہتے ہیں۔ آرام سے اپنی نیند سوتے ہیں دوسرے روز جاگتے ہیں۔ اور تازہ دم ہوکر پھر وہی کام کرتے ہیں جو پہلے روز کیے تھے۔ اِن آدمیوں کو وہ نعمتیں حاصل ہیں جن کو دولتمند اپنی ساری دولت خرچ کرکے کبھی نہیں مول لے سکتے۔

ہم بعض دولتمندوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ رات دن دولت جوڑنے کی فکر میں گرفتار رہتے ہیں کہ اُن کو ہنسی تک کی فرصت نہیں ہوتی اور انھوں نے اس دولت کے کمانے کے لیے اپنی کُل زندگی وقف کردی ہے۔ اُن کا اس قول پر عمل ہے کہ دولت اُس کے واسطے ہے جو محنت کرتا ہے۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ آدمی کا خوش کرنا دولت کے اختیار میں نہیں ہے۔ کیا خُوب ایک حکیم نے لطیفہ کہا ہے کہ دولت کے وَرے پَرے دونوں طرف مصیبتیں برابر ہیں۔ خدا وہ فقر و فاقہ تو دے نہیں کہ جس سے کمر ٹوٹ جائے۔ مگر اتنا دے کہ مایحتاج کو کافی ہو تو پھر قناعت کرکے خُدا کی شکرگذاری میں زندگی بسر کرنی چاہیے۔

آدمی کو نہیں چاہیے کہ وہ اِس کی شکایت کرے کہ عطیاتِ الٰہی غیر مساوی انسانوں میں تقسیم ہوئے ہیں۔ جب تُم کسی شخص میں دیکھتے ہو کہ وہ دولت و مال سے مالا مال ہے تو اُس کی ظاہری حالت کو دیکھتے ہو اور اُس کے تردّدات کو جو حفاظتِ دولت کی کُنجی ہیں نہیں دیکھتے۔ خُدا ہی جانتا ہے دولتمندوں کے کمربندوں میں دولت وہ بوجھ ہے جو چلنے نہیں دیتا۔ دولتمندوں کی ظاہری خوشحالی سب دیکھتے ہیں اور یہ چند ہی آدمی سمجھتے ہیں کہ اُن کا حال ریشم کے کیڑے کا سا ہے کہ اندر ہی اندر اپنے معدے سے مادّہ نکال کر ریشم

تمتا ہے اور خود تحلیل ہوا جاتا ہے۔ ایسے ہی دولتمند دولت کی فکر و تردد سے اندر ہی اندر گھلے جاتے ہیں۔

خدا کا بڑا شکر انسان کو بھیجنا چاہیے کہ اُس نے دولت کی فکروں سے بچایا ہے اور تندرستی کے ساتھ کھانے پینے کو دیا ہے۔ بہت سے آدمی جن عطیات عامۂ الٰہی کو روزانہ دیکھتے ہیں اُن کے شکریہ کا خیال نہیں کرتے اور نہ کچھ اُن کی قدر کرتے ہیں۔ اگر ایک ہی دفعہ گھنٹہ بھر کے لیے اندھے کی آنکھوں کو خدائے تعالیٰ کھول دے اور وہ آفتاب کو دیکھے تو اُس کی عظمت و شان وہ آنکھوں میں سما جائیگی کہ پھر کسی دوسری چیز کی طرف خواہ وہ کیسی ہی خوبصورت فرحت افزا ہو نظر ڈالنے کو جی نہیں چاہیگا اور متحیّر ہو کر اُس کی تعریف کریگا۔ پس ایسی نعمت پر جیسی کہ آفتاب ہے اور جس کو کہ تم روز دیکھتے ہو شکر نہ بجالاؤ تو بڑی کافر نعمتی ہے۔ آفتاب کے سوا اور عطیات اور انعامات الٰہی جیسے ہَوا پانی وغیرہ جو عام ہیں اُن پر شکر بھیجنا لازم ہے غرض خدا نے ہمارے لیے آفتاب کو بنایا ہے وہی ہماری حفاظت کرتا ہے وہی مینہ برساتا ہے پھول کھلاتا ہے۔ معدہ بناتا ہے۔ اس کے لئے غذا مہیا کرتا ہے۔ قناعت فراغت ہمارے چین کے لیے دیتا ہے۔ اُس کا شکر لاکھ لاکھ بھیجنا چاہیے۔

(ذکاء اللہ دہلوی)

سوالات

۱۔ ہم کو خدا کا ہزار ہزار۔ لاکھ لاکھ شکر کیوں کرنا چاہیے؟
۲۔ وہ کونسی نعمتیں ہیں جن کو دولتمند اپنی تمام دولت خرچ کرکے بھی نہیں خرید سکتے؟
۳۔ ثابت کرو کہ دولت کے بڑے بڑے دولتوں والوں پر مصیبتیں ہیں؟
۴۔ دولتمندوں کی باطنی حالت کیا ہوتی ہے؟

۵- خدا کی نعمتوں کا شکر ہر وقت اور ہر حال میں کرنا کیوں ضروری ہے اور اس میں کمی کرنا کیوں کافر نعمتی ہے؟

قسطنطنیہ

قسطنطنیہ سا خوشنما اور خوبصورت شہر ساری خدائی میں نہیں۔ یہ شہر ساحلِ بحر مارمورا پر واقع ہے اور کہسار رفیع اُس کے سامنے اور بھی لطف مزید دکھاتے ہیں۔ تین حصے مکانات شہر کے سمندر سے صاف نظر آتے ہیں۔ اور عجیب کیفیت دکھاتے ہیں۔ مغرب کی سمت ایک بڑی عمیق کھائی ہے۔ اور شہر پناہ نہایت محکم اور مرتفع چار میل تک گئی ہے۔ یہ دیوار کوہ رفعت شاہ تھیودوسیس نے بنوائی تھی جا بجا مینار اور اُن کے چمکتے دمکتے سر طوق اور آبنوس کے عظیم الشان پھاٹک ہیں شہر خود پہاڑی پر واقع ہے۔ دُور سے عموماً اور ساحلِ بحر سے خصوصاً نیلگوں پتھروں کی اونچی اونچی مسجدیں اور اُن کے متعدد مینار اور انواع واقسام کے مکانات قابلِ دید ہیں بلکہ دیدنی نہ شنیدنی ہیں۔ بلند باغ اس شہر میں اس کثرت سے ہیں کہ کوئی محلہ ایسا نہیں جس میں دس بارہ باغ نہ ہوں۔ چمن طرازی اور خیاباں پردازی اس شہر کے کامل فن باغبانوں پر ختم ہے ایسی چمن بندی کبھی کاہیکو دیکھنے میں آئی تھی۔ اکثر اشجار بہت بہار اس قدر بلند ہیں کہ گویا آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ ساحلِ بحر پر کھڑے ہو کر ادھر سمندر اُدھر شہر کی کیفیت ایسی بھلی معلوم ہوتی ہے کہ بیان سے باہر۔ اکثر درخت سدا بہار ہیں۔ خزاں پتا توڑ بھاگتی ہے۔ عروسانِ چمن نے بہار کو اپنے بس میں کر لیا ہے ساحلِ بحر پہ ہر قسم کے جہاز ہر ملک کے آدمی۔ ہر سلطنت کے نشان دیکھ لیجیے۔ بڑے بڑے جہاز بند

سیاحوں کا قول فیصل ہے کہ ساری خدائی میں منظر کی یہ خوبی نہیں جو جہاں آفریں نے اس شہر اور اُس کے ساحلِ بحر کو عطا فرمائی ہے۔ سروِ آزاد نہالانِ بہار کے چوبدار ہیں۔ تمام یورپ میں ایسے سرو نہیں جیسے اس شہر کے باغوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ کیلے بھی باغوں کی آخری روشوں میں لطف دیتے ہیں۔ انجیر۔ شہتوت۔ کھجور۔ اور تاڑ اس دارالسلطنت کے گرداگرد مختلف مقامات پر بوئے گئے ہیں۔ جنوب کے سمت پہاڑوں کی قطار ہے جس کی چوٹی ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ گو قدرت نے اس خطۂ خوش سواد کو رشکِ گلستانِ ارم بنایا ہے۔ لیکن ہنر نے اُس کو کما حقہٗ ترقی نہیں دی ورنہ ملک کا ایک ایک گاؤں بہشتِ بریں پر خندہ زن ہوتا اور اس شہر مینو چہر کو اور شہروں کے مقابل میں ملک کہتے۔

بازار عموماً تنگ ہیں مگر قبرستان کی اس قدر افراط ہے۔ کہ ہر مقام پر دو چار تکیے موجود ہیں۔ بازاروں میں گاڑیوں اور گھوڑوں کی آمدورفت کم ہے جیسے بڑے شہروں کا قاعدہ ہے کہ خاص خاص بازاروں اور نخاس اور چوک میں شور و غل مچا کرتا ہے ویسا یہاں نہیں اور بعض بعض مقامات پر تو

بازار مثل شہر خموشاں خموش ہیں

فٹن پالکی گاڑی اور اڈے کی یہاں صورت بھی دیکھنے میں نہیں آتی ایک قسم کی رنگین چھوٹی گاڑی ہوتی ہے جس کو ارابہ کہتے ہیں۔ اُس میں بھینسے جوتے جاتے ہیں۔ ان گاڑیوں میں اکثر خاتونیں اور معزز عورتیں ہوا کھانے نکلتی ہیں جس طرح ہندوستان میں بہل گاڑی قدم قدم چلتی ہے اسی طرح ارابہ بھی جاتا ہے۔ یہاں کے لئے سرخی مائل رنگ کے ہوتے ہیں۔ مگر بد قطع چھوٹے چھوٹے کان۔ بازاروں میں پڑے رہتے

ہیں۔ اور جب تک چھڑی سے کوئی اٹھاتا نہیں تب تک نہیں اٹھتے بشب
کو دس بجے کے بعد شہر میں سناٹا ہو جاتا ہے۔
آتش زدگی کے وقت پہرے والے غل مچاتے ہیں کہ آگ لگی آگ لگی
حکم سلطانی ہے کہ اگر عرصۂ دراز تک غل نہ ہو تو وزراء خود جائیں اور بندوبست
کریں۔ بادشاہ نے حکم دے رکھا ہے کہ اگر ہم نوافل سو رہے ہوں تو
آتش زدگی کے وقت ہم کو جگا دو اگر ہم نہ جاگیں تو پلنگ الٹ دو
کئی بار خود حضرت سلطان المعظم بنفس نفیس آگ فرد کرنے کے لیے
تشریف لائے۔
اس شہر میں تخمیناً دس لاکھ آدمیوں کی آبادی ہوگی۔ مگر مردم شماری کا
قاعدہ اچھی طرح جاری نہیں ہے۔ پندرہ ہزار کلٹ گیہوں روز صرف میں آتا
ہے۔ یہ وزن قریب چار لاکھ بیس ہزار سیر کے ہوا۔ ترکوں کے علاوہ یونانی
یہودی۔ ارمن اور فرنگ آباد ہیں۔ ان سب کی وضع اور قطع۔ لباس اور
پوشاک بالکل مختلف ہے۔ اور مختلف حصوں میں بود و باش رکھتے ہیں۔
بارگاہِ سلطانی کی عظمت حیطۂ تحریر سے خارج ہے۔ ایسے ایسے عالیشان
ایوان رفیع اور گراں بہا عمارات دیکھنے میں آتی ہیں کہ آدمی ہندوستان کے
مکانوں کو بھول جاتا ہے۔ ان تاج محل کے ٹکر کی ایک عمارت نہیں بارگاہ
سلطانی کیا ہے شہر کے اندر ایک اور شہر ہے۔ بارہ پھاٹک ہیں۔ کوئی اٹھتیس ہزار
آدمی اس میں رہتے ہیں۔ دو سمت سمندر لہریں مارتا ہے۔ اور ایک طرف شہر ہے۔
قسطنطنیہ کی آب و ہوا نہایت خوشگوار ہے۔ اپریل سے ستمبر تک ہوا
پُروائی چلتی ہے اور موسم زمستان میں جنوبی ہوا اور گرد پہاڑوں کی چوٹیاں
برف سے ڈھکی ہوئی کمال لطف دکھاتی ہیں۔ لیمو اور نارنج کے

درخت میدانوں میں بوئے جائیں تو مرجھا کر کانٹا ہو جائیں وجہ یہ کہ آب و ہوا اِس درجہ معتدل ہے کہ درخت سرسبز نہیں ہونے پاتے۔ گرمی چاہتے ہیں۔ لہذا کسی قدر سائے میں بوئے جاتے ہیں۔ بارش کم ہوتی ہے۔ اِدھر گھٹا چھائی مینہ برسا۔ اُدھر کھُل گیا یہاں تخمینہ کیا گیا ہے کہ قسطنطنیہ میں ۴۴ دن تو پانی برستا ہے۔ پانچ روز برف پڑتی ہے پندرہ روز آندھی آتی ہے۔ بیس روز بادل رہتا ہے۔ اور چھتیس دن ہوا بدلتی رہتی ہے۔ اور ۲۴۰ دن مطلع بالکل صاف رہتا ہے۔

اِس شہر کا نام پہلے زینتیم تھا۔ بہانہ کے نام سے ۳۳۰ء میں ایک شاہنشاہ نے اِس کو نیو روم کا خطاب دیا۔ ترک اس کو استنبول کہتے ہیں اس کا بانی کانسٹین ٹائن تھا۔ اِسی کے نام سے یہ شہر کانسٹین ٹینوپل مشہور ہوا۔ اور عرب اور فارس میں اِسے قسطنطنیہ کہنے لگے۔ یورپ اور ایشیا اور افریقہ سب کے وسط میں ہے۔ ایسا کوئی اور شہر نہیں جس کو اِس قدر فائدہ حاصل ہو۔ یہ دو سمندروں کے درمیان واقع ہے۔

(فسانۂ آزاد پنڈت رتن ناتھ)

سوالات

۱۔ قسطنطنیہ کا موقع اور اُس کا دُور سے نظارہ ظاہر کرو؟
۲۔ قسطنطنیہ میں باغوں کی کیا کیفیت ہے مفصل بیان کرو؟
۳۔ اگر شہر نے قسطنطنیہ کو کما حقہٗ ترقی دی ہوتی تو کیا نتیجہ ہوتا؟
۴۔ قسطنطنیہ کے بازاروں اور قبرستانوں کی نسبت کیا جانتے ہو؟
۵۔ قسطنطنیہ میں گاڑیوں کا طرز کیا ہوتا ہے؟
۶۔ قسطنطنیہ میں آتش زدگی کے متعلق کیا انتظام ہے؟
۷۔ قسطنطنیہ کی مردم شماری کتنی ہے اور یہاں کتنا محصول خرچ ہوتا ہے؟

٨۔ قسطنطنیہ میں بارگاہ سلطانی کی کیا کیفیت ہے؟
٩۔ قسطنطنیہ کی آب و ہوا کیسی ہے۔ اور عموماً کون کون پودے یہاں پائے جاتے ہیں؟
١٠۔ قسطنطنیہ کے مختلف اوقات میں کیا کیا نام رکھے گئے اور اس کو کس نے آباد کیا تھا؟

بے تعصبی

بے تعصبی خدا کی رحمت ہے۔ اور تعصب غضب الٰہی ہے۔ بے تعصبی ایک نور ہے جو اپنی روشن کرنوں سے سارے عالم کو منور کر دیتا ہے اور تعصب بھڑکتی ہوئی آگ ہے جو عالیشان اور سربفلک محلوں اور ایوانوں بلکہ بڑے بڑے شہروں اور آبادیوں کو دم بھر میں جلا کے خاک کر دیتی ہے۔ اگلی تاریخ بتا رہی ہے کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے فساد اور ہنگامے ہوئے ہیں سب اسی ظالم تعصب کی بدولت ہوئے۔ اسی نے بابل کی عمارتوں کو خاک کا ڈھیر بنا دیا۔ اسی نے دولت فراعنہ کی زبردست عمارت منہدم کی۔ اسی نے بیت المقدس کو بابلیوں اور رومیوں کے ہاتھوں سے اجڑوا دیا اور اسی نے بغداد میں تاتاریوں کی تیغ خون آشام سے لاکھوں آدمیوں کو قتل کرایا۔ اسی نے بڑی بڑی قوموں کو ابھار کے کھڑا کیا۔ جنہوں نے تعصب کے جوش میں ماسبق تمدن و تہذیب کو دم بھر میں مٹا دیا۔ یہی تعصب تھا جو برابر صدیوں تک دور دراز ممالک کے لوگوں کو کھینچ کھینچ کے بیت المقدس کی دیواروں کے نیچے لاتا اور قتل کراتا رہا۔ مختصر یہ کہ اگلی جتنی نامی گرامی قومیں اور جتنی دنیا کی بارونق بنانے والی تہذیبیں تباہ و برباد ہوئی ہیں سب اسی تعصب کے ہاتھوں تباہ ہوئیں۔

موجودہ تہذیب نے عالم اخلاق میں اگر کوئی فتح حاصل کی ہے تو صرف یہ کہ تعصب کو اگر مٹا نہ سکی تو اس میں ایک حد تک اعتدال ضرور پیدا کر دیا۔ مگر افسوس کہ ہم ہندوستانیوں کے دل ابھی تک اسی

پُرانے جوشِ تعصّب سے لبریز ہیں۔ کسی مذہب کی یہ تعلیم نہیں کہ خدا پرستی کے جوش میں تم اپنی اور اپنے پڑوسیوں کی زندگی بے مزہ بنالو اور خُدا کی افضل اور اعلےٰ خلقت کو جو تمہارے ہی جنس کے ہیں ستاؤ اور اُن کی دل آزاری کرو۔ تعلیم کا لازمی نتیجہ ہونا چاہئیے کہ اپنے آئینہ دل کو تعصّب کے زنگ کدورت سے صاف کرلو۔

(شررؔ لکھنوی)

سوالات

۱۔ تعصّب اور بے تعصّبی کا ازروئے تاریخ قدیم مقابلہ کرو؟

۲۔ موجودہ تہذیب کا اثر تعصّب پر کس قدر پڑسکتا ہے۔ اور ہندوستان میں اس کی کیا حالت ہے؟

ہندوں کے علوم

ہندوں کا نایاب علمی ذخیرہ کیا بلحاظ اُن کی مذہبی روایتوں کے اور کیا بلحاظ اُن کے رسم خط کے نہایت ہی قدیم ہے اور جس قدر قدیم ہے اُسی قدر نادر۔ اُن کی پُرانی تصانیف قریب قریب سب نظم میں ہیں جو امر کہ اُن کی قدامت کا زبردست ثبوت ہے۔ ظاہر میں لوگ سمجھتے ہیں کہ نثر نظم پر مقدم ہے۔ لیکن علمی دُنیا میں یہ صحیح نہیں ہے۔ گفتگو میں بیشک نثر کو تقدم ہے مگر جذباتِ دلی کے ظاہر کرتے وقت انسان میں ایک ایسی متانت اور غیر معمولی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے کہ چاہتا ہے اُنھیں کسی غیر معمولی وضع وعنوان سے ظاہر کرے۔ اسی شوق نے انسان کو اُس کے بچپن ہی سے نظم کی طرف متوجہ کردیا۔ جذبات و خیالات شاعرانہ کو نثر میں ادا کرنا شاعری کے بہت دنوں بعد شروع ہوا۔ لہٰذا ہندوں میں اُن کے تمام علوم کا نظم میں ادا کیا جانا ہی

اُن کی قدامت کا ثبوت ہے۔

ہندؤں کے قریب قریب تمام علوم کو مذہب نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ یا اپنا لباس پہنا کر دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اُن کے علوم میں سب سے مقدم چار وید ہیں جو انسان میں مذہبی رُوح پھونکنے کے مکمل ذرائع ہیں۔ اُن میں دعاؤں اور مناجاتوں کے ذریعہ سے فلسفہ دین اور خداشناسی کی بہت اعلیٰ تعلیم دی گئی ہے۔ اِن چار ویدوں کے ماتحت بہت سی اور کتابیں ہیں جن میں طب سپہ گری۔ معماری موسیقی وغیرہ بہت سے فنونِ علمی کا بیان ہے۔

اِن ویدوں اور اُن کی ماتحت کتابوں کے علاوہ ہندوں کے قدیم علمی خزانے کا زیور دو نہایت ہی مہتم بالشان منظوم کتابیں ہیں جو مقدس روایات میں شامل کر دی گئی ہیں۔ یہ دونوں رامائن اور مہابھارت ہیں۔ رامائن میں اجودھیا کے چندر بنسی تاجدار راجہ رام چندر جی کے حالات و واقعات عجیب مؤثر و سحر نما شاعری میں بیان کیے گئے ہیں جو نہایت ہی دلچسپ و نتیجہ خیز ہیں۔ اور تاریخی قصہ کے عنوان سے دینی و روحانی برکتیں ظاہر کرتے ہیں۔ مہابھارت میں عظیم الشان لڑائی مذکور ہے جو ہستناپور کے تخت کے لیے پانڈو اپنے بھائی اعمام کوروؤں سے لڑے تھے اور جس کی نسبت ہندؤں کا عقیدہ ہے کہ دُنیا میں کبھی اِس سے بڑی کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ اِن کتابوں کے مقابلے میں یونان کے مشہور شاعر ہومر کی نظمیں پیش کی جاتی ہیں مگر کیا بہ لحاظ وسعت بیان اور کیا باعتبار شاعرانہ خوبیوں کے یونان کی اُن دونوں پُرانی منظوم کتابوں کو ہندوستان

کی راماین و مہابھارت سے کوئی نسبت نہیں۔

سنسکرت کی نظموں میں عجیب قسم کا سوز و گداز اور نہایت اعلیٰ شیرینی ظاہر ہوتی ہے۔ جس کا آغاز اُن کے قدیم تر شاعر والمیک سے ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب راماین کے علاوہ ایک اور پُر درد واقعہ منظوم کیا ہے۔ والمیک کے متبرک قلم نے جسے سیدھے فیاض سے الہامی مدد ملتی تھی اس حسرت ناک داستان میں کیسا سوز و گداز اور کیسا دل کو تڑپا دینے والا اثر پیدا کر دیا ہوگا۔

ڈراما کی ایجاد اگرچہ بہت پہلے سے ہو چکی تھی مگر کالی داس کی شہرت نے پرانے سنسکرت ڈراما کو تقریباً فنا کر دیا۔ یورپ والے اہل جو اس کے کمالات سے واقف ہوئے ہیں اُسے مشرق کا شیکسپیر کہتے ہیں۔ اِس کا بہترین ڈراما شکنتلا ہے۔ جس کا ترجمہ انگریزی میں سر ولیم جونس نے اور جرمنی زبان میں فارسٹر ہرڈر اور بہت سے سنسکرت داں مصنفین نے کیا ہے۔ ہرڈر کو یہ ڈراما اِس قدر پسند آیا کہ کہتا ہے۔ اِس عظیم الشان ڈراما کا ہر سین ایک چمن ہے جس کی ہر ہر کیاری میں سے دلچسپ واقعات فطرتی طور پر خودبخود پھولوں کی طرح اُگ آتے ہیں۔ اور اس میں کثرت سے وہ پُر اثر اور نازک خیالات ملتے ہیں جن کا یونانی ڈراما میں کہیں پتہ نہیں۔

([illegible])

سوالات

۱- ہندوؤں کے علوم کی قدامت کا زبردست ثبوت کیا ہے؟

۲- نظم و نثر میں کون قدیم ہے اور کیوں؟

۳- ہندوؤں کے تمام علوم کا مذہب کی آغوش میں ہونا ثابت کرو۔ اور ان میں سب سے مقدم کیا ہے؟

۵- ویدوں اور اُن کے ماتحت کُتب کے علاوہ ہندوؤں کے علمی خزانے کا ذخیرہ دو
شاخیں کون کون کتابیں ہیں اور اُن میں کیا کیا تجربات ہیں ؟
۶- سنسکرت کی نقلیں کیسی ہوتی ہیں، اور اُن کا آغاز کس شاعر سے ہوا ہے ؟
۷- ڈراما کا موجد سنسکرت زبان میں کون شاعر ہے اور اُسے کس نام سے موسوم کیا ہے ؟
۸- کالی داس کے ڈراما کے متعلق اہل یورپ کے کیسے خیالات ہیں ؟ اور کن کن زبانوں
میں ان کے ترجمے کیے گئے ہیں ؟

مفلسی

الٰہی تو سب کچھ دے مگر ایک مفلسی نہ دے۔ بیماری ہوگی اُسے
بھگت لینگے۔ بے علمی ہوگی اُسے سمجھ لینگے۔ کمزوری بھی اُٹھا سکتے ہیں۔
تلواریں بھی کھا سکتے ہیں۔ پر ایک تنگدستی نہیں اُٹھا سکتے۔ یہ کلموہی جس
گھر میں جاتی ہے نئو نئو روپ لاتی ہے۔ بھوکا یہ سُلائے۔ پیاسا یہ
پھڑکائے۔ معصوم بچوں پر یہ ترس نہ کھائے۔ بوڑھے اپاہجوں پر رحم
اسے نہ آئے۔ جی کو یہ جلائے۔ جان کو یہ گھلائے۔ جیتے جی یہ مارے۔
زبردستی ہری یہ بلوائے۔ بھلے چنگے کو یہ بیمار ڈال دے۔ ساہ کو چور یہ
بنائے۔ حکمت میں لقمان ہو اور گرہ میں کچھ نہ ہو۔ تو کوئی مُنہ نہیں لگاتا۔
مرتبے میں ولی ہو اور کچھ فیض نہ پہونچائے تو کوئی اُس کے پاس نہیں
پھٹکتا۔ فاضل بھی اِس کے آگے اپنا فضل و ہنر بھول جاتا ہے۔ اور
عاقل بھی اِس جنبیہ کے سامنے بول جاتا ہے۔
مفلسی میں ہنر بھی کام نہیں آتا۔ اور نہ طاقت ہی کچھ ساتھ دیتی ہے
اگر ہنرمند کے پاس دام نہوں تو کہاں سے اوزار خریدے کس سے
قرض اُدھار لائے۔ مفلس اگر بے غرضانہ سلام بھی کریگا تو اُس کے
سلام کو سلامِ روستائی سمجھینگے اور جو کسی بات کی سچی تعریف بھی کریگا

تو ہنسی جانینگے - اگر کوئی کتاب لکھیگا تو کبھی مقبولِ عام نہوگی اور جو
کسی امر میں دانشمندانہ صلاح دیگا تو وہ کبھی بے غرضی پر محمول نہوگی -
بےحیا، بے کہلوائے بےشرم بے بنوائے -

جس کا کوئی مرجاتا ہے اُس کے یہاں نہایت درجہ تین دن ماتم
رہتا ہے - مگر مفلس کا گھر سدا ماتم کدہ اور ماہ محرم بنا رہتا ہے -
دولتمند سے کوئی قصور ہو تو سب چھپا ڈالیں - مفلس سے کچھ خطا
ہو جائے تو بانس پر چڑھا دیں - مفلس کا مردہ بھی خراب اور اُس کی زندگی
بھی خراب - بھلا جب جیتے جی کو کوئی نہیں تو مردہ کو کب پوچھیگا - اُس کا جنازہ
بھی اُٹھائینگے تو اس لحاظ سے کہ کہیں ہمارا محلہ نہ سڑ جائے - بیماری نہ
پھیلے - کسی کو بھوت بن کر نہ چمٹے - جی چاہا تو شرما شرمی کچھ کفن بھی دیا
نہیں تو یوں ہی دبا دیا - دُنیا میں بھی مٹی خراب ہے - اور آخرت میں
بھی عذاب ہے - پیٹ بھرتا تو عبادت کرتا - ثواب کماتا - وہاں کے
عذاب سے چھوٹتا - اب کیا کرے - جیسی پڑے ویسی بھرے -

ہائے ری مفلسی اگر بیوی ہے تو گہنے کپڑے کو ترستی ہے -
چوڑی و مہندی کو پھڑکتی ہے - سہاگن ہے تو بیوہ سے بدتر - بیوی تو
بیوی میاں کے کپڑے دیکھو گے تو بنیے کے توشہ خانے میں نظر آئینگے -
کوئی سود کے بدلے پڑا ہوگا - کوئی مول میں دھرا ہوگا - اگر مکان
ہے تو بی مفلسی اُس کی کڑیاں بکوا رہی ہیں - کواڑ اُکھڑوا رہی ہیں -
زنجیر کے چنے لئے جاتے ہیں - قلابے دوسرے دن کے لئے
گلئے جاتے ہیں -

انگلستان کی سلطنت جو اِس زمانے کی سلطنت پر فوق رکھتی

ہے۔ اِس کا یہی سبب ہے کہ وہ دولتمندی میں کسی کو اپنے برابر
نہیں ہونے دیتی۔ اور نہ کسی کا حق تلف کرتی ہے۔ لین دین کی
بہی کھری ہے۔ انگلستان کا نوٹ ہر جگہ فائدے سے بکتا ہے اور دیگر
سلطنتوں کے نوٹ کوئی بٹے سے بھی نہیں خریدتا۔ یہ ساری باتیں
انگلستان کی نہایت شعاری سوداگری اور آزادی کا ثمرہ ہے۔

کاش ہمارے ہموطن بھی مفلسی کا ساتھ چھوڑ دیں۔ محنت سے ایمانداری
سے۔ حرفت سے۔ صنعت سے۔ مزدوری سے۔ اجرت سے چار پیسے
کمائیں۔ دو اُٹھائیں اور دو ایسے وقت کے لئے بچائیں۔ اصل قناعت
کفایت شعاری ہے۔ اور سب سے بڑی دولت پس اندازی۔ اپنی قوم
میں غیر قوم میں۔ حاکم میں۔ محکوم میں۔ دُنیا میں دین میں چار پیسے کی
عزت ہے۔ ہاں جو عزت اور حرمت کو دو لونڈیاں سمجھکر آزاد کردے
وہ بیچارہ ہے جس طرح بسر کرے۔

(سید احمد دہلوی)

سوالات

۱۔ مفلسی کن کن چیزوں سے بُری ہے اُس کے روپ مصنف نے کیا کیا تحریر کئے ہیں؟
۲۔ مفلسی کی خرابیاں بیان کرو؟
۳۔ ثابت کرو کہ مفلس کا گھر ہمیشہ ماتم خانہ رہتا ہے؟
۴۔ مفلسی کا اثر۔ بیوی۔ سہاگن۔ کپڑوں۔ مکان اور اسباب وغیرہ پر کیا پڑتا ہے؟
۵۔ انگلستان کی سلطنت دُنیا کی تمام سلطنتوں پر کیوں فائق ہے؟
۶۔ مصنف نے اپنے ہموطنوں کی نسبت اپنی کیا تمنا ظاہر کی ہے؟

حاتم طائی

ہمارے لٹریچر میں حاتم کا نام اس کثرت سے آتا ہے۔ اور بچہ بچہ

اِس نام سے اِس قدر آشنا ہے کہ اِس کے اصلی حالات سے نا واقف ہونا نہایت شرم کی بات ہے۔ اسی ضرورت سے ہم چند مختصر حالات اِس کتاب میں لکھتے ہیں۔

حاتم زمانۂ اسلام سے تھوڑے ہی پیشتر عہد جاہلیت میں عرب کا اور عربوں میں قبیلۂ بنی طے کا ایک معزز اور ناموَر شخص تھا۔ جس نے سخاوت۔ شجاعت اور شاعری میں نام پیدا کیا تھا۔ اِس کا شمار سرداران قبیلہ میں تھا۔ اور کبھی اس کا خیمہ مہمانوں سے خالی نہ رہتا تھا۔ عرب کے بدویوں میں بخل سے بُرا کوئی عیب نہ تھا۔ اور ہر شخص کا فرض تھا کہ اپنی شرافت کا ثبوت مہمان نوازی میں دے۔ حاتم نے اس کمال کو جس اعلےٰ درجہ تک دکھایا کہ عرب میں کوئی نہ دکھاسکا۔

حاتم طائی نے زندگی بھر کبھی کسی مہمان کی خاطرداری میں کمی نہیں کی اور کسی سائل کو بے کچھ دیے پھیرا نہیں۔ ابن اعرابی لکھتے ہیں کہ حاتم شاعر اور فیّاض تھا۔ جیسے اعلےٰ درجے کے اُس کے اشعار تھے ویسی ہی بڑھی چڑھی فیّاضی بھی تھی۔ جو کہتا وہ کرتا اور معرکۂ جنگ میں ہمیشہ غالب و فتحیاب رہتا۔ کوئی دست سوال پھیلاتا تو اُسے دیتا۔ کسی سے کسی بات میں مقابلہ ہوتا تو بڑھ جاتا۔ اور کسی کو گرفتار کرتا تو چھوڑ دیتا۔ تمام قبائل عرب ماہِ رجب کی تعظیم کرتے تھے۔ اِس مہینے میں حاتم کا یہ معمول تھا کہ روز دس اُونٹ ذبح کرکے لوگوں کو کھلاتا اور لوگ دُور دُور سے آکے اُس کے خیمہ کے گرد جمع ہوجاتے۔

سردیوں کے موسم میں جب جاڑے کی شدّت ہوتی ہے تو اپنے

غلاموں کو حکم دیتا کہ جا بجا آگ سُلگا دیں تاکہ اُسے دیکھ کے بھُولے
بھٹکے مسافر آجائیں۔ اُس کا معمول تھا کہ ہر چیز میں فیّاضی کرتا۔ اور کوئی
چیز اُس کی داد و دہش سے نہ بچتی سوائے اپنے گھوڑے اور اسلحہ
کے کہ اُنھیں بہت عزیز رکھتا تھا۔ لیکن آخرکار جوشِ سخاوت اس احتیاط
اور عاقبت اندیشی پہ بھی غالب آیا جنھیں خدا کی راہ میں دیکے اُس نے
عجیب و غریب قسم کی بخشش اور قابلِ حیرت فیّاضی کا ثبوت دیدیا۔
اور دراصل یہی وہ واقعات ہیں جنھوں نے اُسے دُنیا میں جود و سخا
کی مجسّم تصویر ثابت کردیا۔ اور اگر اُس کی قوم کچھ دنوں تک اور
بُت پرست بنی رہتی تو یقیناً وہ فیّاضی کا دیوتا بن جاتا۔

گھوڑے کا واقعہ خود اُسی کی بی بی ماویہ بیان کرتی ہے کہ ایک
سال قحط پڑا۔ قبیلہ والوں کے کپڑے لتّے تک بک گئے اور سب
فاقہ کر رہے تھے خود میرے گھر میں یہ حالت تھی کہ کھانے کو کچھ
نہ تھا اور ہم سب فاقہ سے تھے۔ اور مارے بھوک کے کسی طرح نیند
نہ آتی تھی۔ ہمارے بچّے عدی اور سفانہ بلک بلک کے رو رہے تھے
آخر میں نے سفانہ کو تھپک تھپک کے بھُوکا سُلا دیا۔ اور حاتم نے
عدی کو بہلا بہلا کے سُلایا۔ اب ہمیں شدّتِ گرسنگی سے سونا
دشوار تھا اُس وقت حاتم نے دلچسپ باتیں چھیڑ کے مجھے بہلانا شروع
کیا۔ تاکہ میں بھی سو جاؤں۔ اُس وقت مجھے اُس بھوک پہ افسوس
آیا اور خاموش ہو کے آنکھیں بند کرلیں کہ شاید خاموشی سے وہ بھی سو جائے۔
مجھے ساکت دیکھ کر اُس نے پوچھا "کیوں سوگئیں" میں نے جواب
نہیں دیا۔ اتنے میں اُس کی نظر خیمہ کے بیرونی صحن کی طرف پڑی تو دیکھا

کہ کوئی آیا ہے۔ چپکے سے اُٹھ کے باہر نکلا۔ اور دیکھا کہ ایک فاقہ زدہ عورت کہہ رہی ہے۔ حاتم! میرے بچے بلک بلک کر روتے اور کتوں کی طرح شور کر رہے ہیں۔ مگر کھانے کو کچھ نہیں نصیب ہے۔ حاتم نے کہا اچھا اپنے بچوں کو لاؤ۔ میں انھیں کھانا کھلا دونگا۔ یہ سنتے ہی عورت اپنے بچوں کو لینے گئی۔ اور حاتم خیمہ کے اندر آیا۔ میں نے سر اُٹھاکے کہا۔ حاتم اِن بچوں کا پیٹ کیونکر بھر دوگے؟ خود تمھارے بچے فاقے سے پڑ رہے ہیں۔ اور بھوک سے بیتاب ہیں۔ بولا "اب تو خدا کی قسم میں انھیں بھی کھلا دونگا اور تمھیں بھی"۔ یہ کہہ کے چھری ہاتھ میں لی اور اپنے عزیز گھوڑے کو ذبح کر ڈالا۔ اس کے بعد آگ روشن کر رہا تھا۔ کہ وہ عورت اپنے بچوں کو لیے ہوئے آگئی فوراً چھری اُس کے حوالہ کی اور کہا۔ لو کاٹو۔ بھونو۔ کھاؤ۔ اور بچوں کو کھلاؤ۔" جب وہ سب سیر ہو چکے تو میں نے اپنے بچوں کو جگا کے کھلایا۔ اور خود کھایا۔ اب حاتم نے کہا "یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ ہم اپنا پیٹ بھر لیں اور قبیلے والے فاقے سے ہوں،" یہ کہتے ہی قبیلے کے ایک ایک خیمہ کے دروازے پر جا کے لوگوں کو جگایا اور کہا "جلدی آؤ۔ آگ روشن ہے اور گوشت تیار ہے۔" سب لوگ آ کے گوشت پر جھک پڑے۔ بے تکلف کھانا شروع کیا۔ اور حاتم منہ کو اپنی چادر میں لپیٹ کے اور چھپا کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

صبح ہوتے ہوتے سوا کھروں اور ہڈیوں کے کچھ نہ تھا مگر حاتم نے اُس میں سے ایک ریشہ بھی نہیں چکھا تھا۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ سب سے زیادہ بھوکا وہی تھا۔

یہ تو گھوڑے کی فیّاضی تھی۔ مگر اسلحہ کی فیّاضی اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب تھی۔ ایک بار کسی قبیلہ والوں نے بنی طے پر چڑھائی کی حاتم نے فوراً عزیزوں خاندان والوں اور اہل قبیلہ کو لڑائی پر مستعد کیا۔ اور نیزہ ہاتھ میں لے کے نہایت ہی شجاعت اور دلیری سے مقابلے پر جا کے کھڑا ہو گیا۔ لڑائی سخت تھی۔ مگر حاتم کی شجاعت سے بنی طے نے اپنے حریفوں کو شکست دیدی۔ اور اُن کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ اس حالت میں دشمنوں کے سردار نے حاتم سے کہا "حاتم! اپنا نیزہ مجھے دیدو" یہ سُنتے ہی حاتم نے بلا تامل اپنا نیزہ اُس کے سامنے پھینک دیا اور نہتا ہو گیا دُشمن نیزہ لے کے چلا گیا۔ اور حاتم گھر پر آیا تو لوگوں نے کہا "آج تو آپ نے غضب ہی کر دیا تھا۔ اپنا نیزہ دُشمن کے حوالے کر دیا۔ اور وہ جو پلٹ پڑتا تو بھلا آپ کی زندگی کی کوئی بھی اُمید تھی؟ حاتم نے کہا۔ یہ تم سچ کہتے ہو۔ لیکن اگر کوئی کسی چیز کو مانگے تو پھر اس کا جواب کیا دیا جائے؟

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حاتم کے نزدیک حاجتمند اور سائل کا جواب سوا اُس کی درخواست قبول کرنے کے اور کوئی تھا ہی نہیں۔

(شرر لکھنوی)

سوالات

۱۔ حاتم کے اصلی حالات سے واقف ہونا کیوں ضروری ہے؟

۲۔ حاتم کب اور کس خاندان میں پیدا ہوا اور اُس کے خاندان سے اُس کو کیا سبق ملا؟

۳۔ حاتم اپنے مہمانوں کی خاطر و مدارات میں کیسی کیسی فیّاضی برتتا تھا؟

۴۔ وہ سردی کے موسم میں اپنے مہمانوں کی آسائش کے لئے کیا کیا انتظامات کرتا تھا؟

۵۔ اگر حاتم کی قوم کچھ مدت تک اور بت پرستی کرتی رہتی تو حاتم کو اپنی سخاوت کا کیا نتیجہ ملتا؟

۶۔ حاتم کی بی بی ماویہ نے اُس کے گھوڑے کا واقعہ کیا بیان کیا ہے؟
۷۔ حاتم کی اسلحہ کی فیاضی کا قصہ بیان کرو؟

اُردو اور انگریزی کی انشاپردازی

اگر زبان کو فقط اظہارِ مطالب کا وسیلہ ہی کہیں تو گویا وہ ایک اوزار ہے کہ جو کام ایک گونگے بیچارے یا بچے نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں وہی اُس سے ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اُس کا مرتبہ اِن لفظوں سے بہت بلند ہے۔ زبان حقیقت میں ایک معمار ہے کہ اگر چاہے تو باتوں باتوں میں ایک قلعہ فولادی تیار کر دے جو کسی توپ خانے سے نہ ٹوٹ سکے اور چاہے تو ایک بات میں اُسے خاک میں ملا دے جس میں ہات ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادوگر ہے جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیار کر دیتا ہے۔ اور جو اپنے مقاصد چاہتا ہے اُن سے حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ایک نادر مرصع کار ہے کہ جس کی دستکاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج اور کبھی شہزادیوں کے نَو لکھے ہار ہوتے ہیں۔ کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زر و جواہر اُس کی قوم کو مالا مال کرتے ہیں۔ وہ ایک چالاک عیّار ہے جو ہوا پر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے قفل کھولتا اور بند کرتا ہے۔ یا مصوّر ہے کہ نظر کے میدان میں مُرقع کھینچتا ہے۔ یا ہوا میں گلزار کھلاتا ہے۔ اور اُسے پھول۔ گُل۔ طوطی و بُلبل سے سجا کر تیار کر دیتا ہے۔

اِس نادر دستکار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح بو قلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں۔ لیکن اِس کے استعاروں اور تشبیہوں

کے رنگ ایسے خوشنما ہیں کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کرکے لال
چہچہا کردیتا ہے پھر بے اِس کے کہ بوند پانی اُس میں ڈالے ایک ہی بات
ہیں اُسے ایسا کردیتا ہے کہ کبھی نارنجی۔ کبھی گلناری۔ کبھی آتشی۔ کبھی
ایسا بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے کہ دیکھکر جی خوش ہو جاتا ہے۔ اسی طرح
جو قلمو اور رنگارنگ اور پھر سرتاپا عالمِ نیرنگ۔

جس زبان میں ہم تم باتیں کرتے ہیں اسی میں بڑے بڑے نازک
قلم مصوّر گذرے ہیں جن کے مُرقعے آج تک آنکھوں اور کانوں کے
رستے سے ہمارے اور تمھارے دلوں کو تازہ کرتے ہیں۔ لیکن افسوس
ہے کہ آجکل گویا اُن کے قلم گھِس گئے ہیں اور پیالیاں رنگوں سے
خالی ہوگئی ہیں۔ جب سے تمھاری زبان کوئی نئی تصویر یا باریک کام کا
مرقع تیار کرنے کے قابل نہیں رہی اور تعلیم یافتہ قومیں اُسے سنکر
کہتی ہیں کہ یہ ناکامل زبان ہر قسم کے مطالبات ادا کرنے کی
قدرت نہیں رکھتی۔

میرے دوستو! یہ قول اُن کا حقیقت میں بیجا نہیں ہے۔ ہر ایک
زبان تعلیم یافتہ لوگوں میں جو عزّت پاتی ہے۔ تو دو سبب سے پاتی
ہے۔ اوّل یہ کہ اُس کے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب
ادا کرنے کے سامان موجود ہیں۔ دُوم اُس کی انشا پردازی ہر رنگ اور
ڈھنگ میں مطالب کے ادا کرنے کی قوّت رکھتی ہو۔ ہماری زبان میں
یہ دونوں صفتیں ہیں۔ مگر ناتمام ہیں۔ اور اِس کے سبب ظاہر ہیں۔
علمی مطالب ادا کرنے کے سامانوں میں وہ مفلس ہے اِس کا
سبب یہ ہے کہ تم جانتے ہو کُل ڈیڑھ سو برس تخمیناً اُس کی ولادت

کو ہوئے۔ اِس کا نام اُردو خود کہتا ہے کہ میں علمی نہیں بازار کی زبان ہوں۔ اُٹھتے بیٹھتے لین دین کی باتوں کے کام میں آتی ہوں سلاطین چغتائیہ کے وقت تک اِس میں تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ ایک بچہ شاہجہاں کے گھر میں پیدا ہوا اور انگریزی اقبال کے ساتھ ستارہ چمکے جب صاحب لوگ یہاں آئے تو اُنھوں نے ملکی زبان سمجھ کر اس کے لکھنے کا ارادہ کیا۔ مگر سوا چند دیوانوں کے اِس میں نثر کی کتاب تک نہ تھی اُن کی فرمائش سے کئی کتابیں کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں۔ تصنیف ہوئیں اور اُنھیں کے طفیل کی صرف و نحو بھی درست ہوئی ۱۸۳۵ء سے دفتر بھی اُردو ہوئے شروع ہوئے ۱۸۳۶ء میں ایک اُردو اخبار جاری ہوا۔ ۱۸۴۲ء سے دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں اسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں اور اُردو نے بڑے نام زبان کا تمغہ اور سکہ پایا۔ اب خیال کرنا چاہیے کہ جس زبان کی تصنیف عمر کُل ستر بہتر برس کی ہو اُس کی بساط کیا۔ اور اُس کے الفاظ کے ذخیرے کی کائنات کیا۔ پس اِس وقت ہمیں اُس کی کمی الفاظ سے دل شکستہ ہونا نہ چاہیے۔

میرے دوستو! کسی زبان کو لفظوں کے اعتبار سے مفلس یا صاحب سرمایہ کہنا بیجا ہے۔ ہر زبان اہل زبان کے باعلم ہونے سے سرمایہ دار ہوتی ہے۔ اور کسی ملک والے کا یہ کہنا کہ علمی تصنیف یا بات چیت میں اپنے ہی ملک کے الفاظ بولیں بالکل بیجا ہے۔

عربی بھی ایک علمی زبان تھی مگر دیکھو تو اُس میں سارے لفظ تو عربی نہیں۔ صدہا رومی۔ صدہا یونانی۔ صدہا فارسی کے لفظ ہیں وغیرہ

وغیرہ۔ اور زبان کا تو ذکر ہی نہیں۔ انگریزی زبان آج علوم کا سرچشمہ بنی بیٹھی ہے مگر اس میں بھی غیر زبان کے لفظوں کا طوفان آرہا ہے۔ زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اہلِ ملک میں علم آتا ہے۔ پھر علمی اشیا کے لیے الفاظ یا تو اس علم کے ساتھ آتے ہیں یا وہیں ایجاد ہوجاتے ہیں۔

علمی الفاظ کا ذخیرہ خدا نے بنا کر نہیں بھیجا۔ نہ کوئی صاحب علم پہلے سے تیّار کر کے رکھ گیا۔ جیسے جیسے کام اور چیزیں پیدا ہوتی گئیں ویسے ہی اُن کے لیے الفاظ پیدا ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اوّل خاص و عام میں علم پھیلتا ہے ساتھ ہی اس کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں۔ مثلاً ریل کا انجن اور اُس کے کارخانے کے صدہا الفاظ ہیں کہ پہلے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا جب وہ کارخانے ہوگئے تو ادنے ادنے ناخواندے سب جان گئے اگر بے اُس کے وہ الفاظ یہاں ڈھونڈتے یا پہلے یاد کراتے تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آتے۔ اسی طرح مثلاً میجک لینٹرن اس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا۔ خواہ اس کا یہی نام لیں خواہ فانوس جادو کہیں۔ خواہ اچنبھے کا تماشا کہیں۔ ہرگز کوئی نہیں سمجھیگا۔ لیکن اگر شاہدے میں عام ہوجائے تو اُلٹے سے اُلٹا اُس کا نام رکھ دیں وہی بچّے بچّے کی زبان پر مشہور ہوجائیگا۔ اور وہی سب سمجھیں گے۔

انگریزی میں جو علمی الفاظ ہیں مثلاً ٹیلیگراف یا الکٹریسٹی وغیرہ وغیرہ ان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ وہ اپنے اصل معانی پر پوری دلالت نہیں کرتے مگر چونکہ ملک میں علم عام ہے اور وہ چیزیں عام ہیں اس لئے الفاظ مذکورہ بھی ایسے عام ہیں کہ سب بے تکلف

سمجھتے ہیں۔ پس لفظوں کی کوتاہی اگر ہماری زبان میں ہے تو اس سبب سے ہے کہ وہ بے علمی کے عہد میں پیدا ہوئی۔ اور اسی عہد میں پرورش اور تربیت پائی۔ اب اس کی تدبیر ہوسکتی ہے تو اہلِ ملک ہی سے ہوسکتی ہے۔ وہ یہ کہ خود علوم و فنون حاصل کرو۔ اپنے ملک میں پھیلاؤ اور بھائی بندوں کو اس سے آگاہ کرو۔ جب تم میں سب قسم کے کاروبار ہونگے تو ان کے الفاظ بھی ہونگے۔ ملک کے افلاس کے ساتھ زبان سے بھی افلاس کا داغ مٹ جائیگا۔

(محمد حسین آزاد)

سوالات

۱۔ مصنف نے زبان کو "اظہار مطالب کا وسیلہ" کے علاوہ کن کن القاب سے ملقب کیا ہے؟ کیا یہ القاب زبان پر صادق آتے ہیں۔ مفصل بیان کرو؟

۲۔ "نازک قلم مصور" کن لوگوں سے مراد ہے اور ان کو ایسا کیوں کہا گیا ہے؟

۳۔ زبان کے عزت پانے کے دو خاص اسباب بیان کرو؟

۴۔ ہماری زبان میں علمی مطالب ادا کرنے کی کمی کا کیا سبب ہے؟

۵۔ ثابت کرو کہ زبان الفاظ کی کمی کے سبب سے مفلس نہیں کہی جاسکتی؟

۶۔ علمی الفاظ کا ذخیرہ کہاں سے آیا؟

۷۔ انگریزی میں علمی الفاظ کی کثرت کی کیا وجہ ہے؟

شیر شاہ سوری

شیر شاہ کا اصلی نام فرید خاں تھا۔ اس کا دادا ابراہیم خاں سلطان بہلول لودی کے عہدِ سلطنت میں گھوڑوں کی سوداگری کرتا تھا۔ سکندر لودی کے زمانے میں ابراہیم خاں نے جمال خاں حاکمِ جونپور کی ملازمت اختیار کی۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کا بیٹا حسن خاں جانشین ہوا۔ اور اپنی لیاقت و کاردانی سے ترقی پاکر پانچسو

سواروں کا افسر ہوگیا۔ سہسرام اور ٹانڈہ جاگیر میں پایا۔ یہیں شیر شاہ
پیدا ہوا۔ اور عین شباب کے عالم میں اپنے باپ سے ایک بات پر
رنجیدہ ہوکر جونپور چلا گیا۔ اور جمال خاں کی خدمت میں حاضر ہوکر
تحصیل علم میں مشغول ہوا۔ اور نہایت شوق و ذوق سے علم حاصل
کیا باپ نے جب بیٹے کو ہوشیار دیکھا تو بلا بھیجا مگر یہ نہ گیا بالآخر کار
خود جونپور آکر نہایت اصرار سے بیٹے کو اپنے ساتھ لے گیا اور اپنی
جاگیر کا مختار کرکے سہسرام کو روانہ کیا۔ شیر شاہ نے نہایت عقلمندی
سے جاگیر کا انتظام کیا۔ اور باپ کے مرنے کے بعد خود اُس کا مالک ہوا
اُسی عرصہ میں سلطان بابر نے ابراہیم لودی سے ہندوستان جیت لیا
لودی خاندان کا ایک امیر کہ بہار کا حاکم تھا۔ سلطان محمود کے خطاب
سے خود مختار ہو بیٹھا۔ شیر شاہ اُس کی ملازمت میں حاضر ہوکر عمدہ
خدمتیں بجا لایا۔ ایک دن شکار گاہ میں نہایت مردانگی دکھلائی۔ اور تلوار
سے شیر کا شکار کرکے شیر خاں کے خطاب سے موصوف ہوا۔ بعد چند
شیر خاں سلطان محمود سے کسی بات پر بدگمان ہوکر اُس کے پاس سے
چل دیا۔ اور بابری امیر جنید برلاس کی خدمت میں حاضر ہوکر خاص
تقرب حاصل کیا۔ اور اسی کے ساتھ بابر کے دربار میں آیا۔ یہاں
مغلوں کا رنگ ڈھنگ دیکھکر اُس کی اولوالعزمی نے جوش مارا اور
بادشاہی کے خیالات پیدا ہوئے۔ اکثر یاروں سے کہا کرتا تھا کہ تمام
مغل عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور آج کل کا کام کل پر موقوف
رکھتے ہیں۔ اگر میری قوم ساتھ دے تو میں مغلوں کو ہندوستان
سے اِس طرح نکال دوں جیسے دودھ سے مکھی کو نکالتے ہیں اُس کے

دوست اِن باتوں پر ہنستے تھے۔ ایک دن شیر خاں جنید برلاس کے
ساتھ دعوتِ شاہی میں شریک ہوا۔ بابر بلا کا قیافہ شناس تھا۔ اُس کے
تیور دیکھتے ہی دل میں کھٹک گیا۔ اور فوراً قید کا حکم دیا۔ جنید برلاس
نے عرض کی کہ اگر جہاں پناہ اسے قید فرمائینگے تو دربار سے پٹھانوں
کی آمد و رفت بالکل بند ہو جائیگی بابر یہ سُنکر چپ ہو رہا اگرچہ تمام
گفتگو ترکی زبان میں ہوتی تھی مگر شیر خاں طرزِ کلام سے کل مطلب
سمجھ گیا اور اِس دربار میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھکر بہار کے حاکم
کے پاس جا پہونچا۔ وہاں اُس نے ایسا اقتدار پیدا کیا کہ سلطان محمود
کے مرنے کے بعد خود مالک بن بیٹھا اور قُرب و جوار کے علاقوں اور
قلعوں کو فتح کر کے ۹۴۵ھ میں تمام بنگال اور پٹنہ پر قابض ہو گیا
سلطنت کا شوق مُدت سے اُس کے دل میں ٹھہر رہا تھا۔ بابر کے
مرنے کے بعد جب اُس نے دیکھا کہ ہمایوں اور اُس کے بھائی آپس میں
نفاق رکھتے ہیں اور وہ اور اُن کے تمام اُمرا آرام طلب اور عیش پسند
ہیں۔ تو اُس نے پادشاہی علاقے پر ہاتھ پھیلانا شروع کیا۔ اور تمام
افغانوں کے دلوں میں اتفاق کے ساتھ قومی ترقی اور ہمت و حوصلہ
کی رُوح پھونک کر انھیں ایسا سپاہی بنا دیا کہ جدھر کا رُخ کیا
کامیابی نے "خوش آمدید" اور "صفا آوردید" کا گیت سُنایا۔ دشمن
یا تو لشکر ہار ا یا اُس کے دائرہ بیعت میں آ گیا۔ آخر کئی خونریز
معرکوں کے بعد شیر خاں نے ہمایوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا۔
اور ۹۴۷ھ میں محض اپنی قوتِ بازو سے کل سلطنتِ ہند کا مالک
ہو کر شیر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اور اگرچہ مرگِ بے ہنگام نے

اسے پانچ سال سے زیادہ سلطنتِ ہند کا نظم و نسق نہ کرنے دیا
مگر اس قلیل زمانے میں اُس نے فلاحِ عامہ کے ایسے ایسے کام کیے۔
انصرامِ سلطنت کے ایسے ایسے نادر اصول باندھے کہ مشکل سے کوئی
بادشاہ ہوگا جس نے اپنی پنجاہ سالہ حکومت میں بھی اس سے زیادہ
یادگاریں چھوڑی ہوں۔ پندرہ برس امارت اور سلطنت کے حاصل
کرنے میں صرف ہوئے۔ صرف پانچ برس سرسبزی کی بہار دیکھی۔

شیر شاہ کی منصف مزاجی زبانزدِ ہر خاص و عام ہے۔ اُس کا
قول تھا کہ عدل تمام خصائلِ حسنہ کا زیور ہے اُس نے جابجا عدالت
کی کچہریاں قائم کیں اور خود عدالت کا ایسا شوقین تھا جب کوئی
ستم رسیدہ اُس کے دربار میں آتا تو سب کام چھوڑ کر اُس کی طرف
متوجہ ہوتا۔ اور ظالم کو خواہ وہ اُس کے بیٹوں۔ عزیزوں یا امیروں
ہی میں سے کیوں نہ ہوتا بغیر سیاست کے نہ چھوڑتا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا
کہ بادشاہوں کے ظلم و غفلت و ارکانِ دولت کی رشوت ستانی
نے مجھے بادشاہ بنایا۔

رہزنی اور چوری کے انسداد کے واسطے شیر شاہ نے یہ قانون
بنایا تھا کہ اگر چور اور رہزن مع مال کے گرفتار نہ ہوں تو جس قدر
مال چوری گیا ہو اُس کی قیمت اُس مقام کے مقدم سے دلائی جائے
جہاں چوری یا رہزنی ہوئی ہو۔ اگر مقام کے تعین میں اختلاف
ہو تو چاروں حدود کے مقدموں کے حدود سے چوری کا معاوضہ
دلایا جائے۔ اور گرفتاری کی حالت میں چور کی شرع کے مطابق
سزا دیجائے۔ اگر کوئی قتل ہوا اور قاتل پکڑا نہ جائے تو عامل مقدموں کے

ذریعہ سے اُس کا پتہ لگائیں۔ ایک مرتبہ اٹاوہ کے قریب ایک قتل ہوا
مقام قتل کی نسبت کہ کس کی حد میں ہے مقدموں میں جھگڑا تھا۔
جب قاتل کا پتہ نہ چلا تو یہ مقدمہ شیر شاہ تک پہونچا۔ بادشاہ نے
خفیہ طور سے دو آدمی تعین کیے کہ مقام متنازعہ پر پہونچکر ایک
درخت کاٹیں ۔ اور جو شخص اُن کو منع کرے اُس کو گرفتار کرکے
دربار میں بھیجیں۔ جب یہ دونوں آدمی وہاں پہونچے اور درخت
کاٹنا شروع کیا تو ایک مقدم نے آکر روکا۔ وہ گرفتار ہوکر بادشاہ
کے روبرو لایا گیا۔ شیر شاہ نے اُس سے کہا کہ اتنے فاصلے پر ایک
درخت کٹنے کی تو تجھے خبر ہوگئی مگر ایک آدمی کے گلا کٹنے کی خبر
نہ ہوئی۔ حکم دیا کہ اِس گانوں کے تمام مقدم قید کیے جائیں۔ اگر وہ
تین دن کے اندر قاتل کا پتہ نہ لائیں تو اُس کے عوض میں وہ
قتل کیے جائینگے۔ آخر دوسرے ہی دن قاتل کا پتہ چل گیا۔ مقدموں
نے قید سے رہائی پائی۔ اِسی عدالت کی سخت گیری کی بدولت
اُس کے عہد میں رہزنی یا دیگر جرائم بہت کم ہوتے تھے۔

شیر شاہ کو زراعت کی افزایش اور حفاظت کا بہت زیادہ
خیال تھا۔ اُس کا حکم تھا کہ میرے ممالک محروسہ میں ہر سال پیمایش ہو۔
اُسی پیمایش کے بموجب جنس کی صورت میں مالگذاری وصول کیجاتی
تھی اُس نے تمام ملک کو پرگنوں میں تقسیم کیا تھا۔ ہر پرگنہ کے واسطے
ایک قانونگو مقرر کیا تھا۔ پرگنہ کا تمام زراعتی حساب کتاب اُس کے
ذمہ تھا۔ ایک امیر۔ ایک شقدار۔ ایک خزانچی۔ ایک کارکن ہندی
نویس۔ ایک فارسی نویس ہر پرگنہ میں متعین رہتا تھا۔ ہر سرکار

میں ایک صدر شقدار اور ایک صدر الصدور رہتا تھا۔ کہ عمال کے مظالم وبیداد سے رعایا کو بچاتے رہیں۔ سال دو سال کے بعد عاملوں کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔ لشکر کے کوچ کی حالت میں بادشاہ بذات خود زراعت کی حفاظت کرتا۔ اگر کسی سپاہی سے ذرا بھی زراعت کا نقصان ہوتا تو اُس کو نہایت سخت سزا دیتا تھا۔ اگر کسی مجبوری سے زراعت پامال ہوتی تو اُس کا کافی معاوضہ دیا جاتا۔ دشمن کے مُلک میں بھی زراعت کے پامال کرنے یا رعایا کے اسیر کرنے کی اجازت نہ تھی اُس کا مقولہ تھا کہ رعیت بے گناہ ہوتی ہے وہ ہمیشہ فریق غالب کی اطاعت کرتی ہے پس اُس کو تباہ کرنا اپنا نقصان کرنا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ دشمن کے مُلک میں بھی اُس کے لشکر کو ہر قسم کی رسد کثرت سے مل جاتی تھی۔ اور اس کا مُلک ایسا سرسبز و شاداب تھا کہ قحط کا تو کیا ذکر کبھی غلّہ کی گرانی بھی نہیں ہوتی۔

شیر شاہ کا قانون تھا کہ سوداگروں اور مسافروں کی ہر طرح سے خاطر داری کیجائے۔ اگر کوئی تاجر مر جائے تو اُس کے مال میں دست اندازی نہ کیجائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو وارثوں کی تلاش کرکے ان کے پاس پہنچا دیا جائے۔ تمام مُلک میں صرف دو جگہ مال تجارت پر محصول وصول کیا جاتا تھا۔ جب بنگال کی طرف سے سوداگر آتا تو گڑھی (سیکری گلی) میں اور جب خراسان کی طرف سے سوداگر آتا تو سرحد پر محصول لیا جاتا تھا درمیان میں کسی کا مقدور نہ تھا کہ کسی قسم کا محصول وصول کرے۔ بادشاہ اور امرا کبھی بازار کے نرخ سے مال خریدتے تھے۔ بادشاہ اکثر سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر پڑھا کرتا۔

بزرگاں مسافر بجاں پرورند — کہ نام نکوئیش بہ عالم برند

ہندوستان میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے جاگیر کا طریقہ
موقوف کرکے فوج کو نوکر رکھا۔ اور داغ کا ضابطہ نکالا۔ فیروز شاہ تغلق
کے عہد میں پھر جاگیریں مل گئیں۔ شیر شاہ نے اپنے زمانے میں داغ
کے آئین کو تازہ کیا۔ اور فوج کی جاگیریں موقوف کرکے تنخواہیں
مقرر کیں۔ وہ اپنے سپاہیوں کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس کی فوج ممالک
محروسہ کی مختلف چھاؤنیوں میں متعین رہتی تھی۔ اور اس کا تبادلہ
ہوتا رہتا تھا۔ قلعہ رہتاس گڑھ۔ بہرہ کنڈ۔ شیر گڑھ وغیرہ کئی قلعے
تعمیر کرائے۔ اور کہا کرتا تھا۔ کہ اگر زندگی نے وفا کی تو ہر سرکار میں
مناسب مقام پر ایک ایک قلعہ تعمیر کراؤں گا۔

شیر شاہ کو خیرات اور امورات رفاہ عام کی طرف خاص توجہ
تھی۔ فقرا۔ مساکین۔ محتاجوں کے واسطے لنگر خانے جاری تھے۔
جہاں ان کو لذیذ کھانے ملتے تھے۔ ان لنگر خانوں کا خرچ پانچسو اشرفی
روز کا تھا۔ اندھے لولے۔ لنگڑے۔ اپاہج۔ بیوہ اور مریض غریب سب
کے نقد وظیفے مقرر تھے۔ مشائخین۔ علما۔ طلباء کی مدد معاش مقرر
تھی۔ اس کا دسترخوان ایسا وسیع تھا کہ عام اجازت تھی کہ جس کا
جی چاہے آئے اور کھائے۔

مسافروں کے آرام کے واسطے اس نے چار سڑکیں بنوائی
تھیں۔ ایک قلعہ رہتاس پنجاب سے سنار گاؤں (بنگال) تک
جو چار ماہ کا راستہ تھا۔ دوسری آگرہ سے برہان پور دکن تک
تیسری آگرہ سے جودھپور اور چتوڑ تک۔ چوتھی لاہور سے ملتان تک

گولے قلعہ میں پھینکے جا رہے تھے۔ ایک گولہ دیوار قلعہ پر لگا اور ٹکرا کر مورچہ پر آیا۔ پاس ہی بارود اور گولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا وہ سب بھڑک اٹھے۔ سیکڑوں سپاہی اور سردار کباب ہو گئے شیر شاہ بھی جھلس گیا۔ کبھی ہوش میں آ جاتا تھا کبھی بیہوش ہو جاتا تھا۔ مگر جب آنکھ کھولتا للکار کر حملے کا حکم دیتا تھا۔ جب کوئی سردار اسے دیکھنے آتا اس سے کہتا یہاں کیوں آئے ہو قلعہ پر چڑھ جاؤ۔ صندل اور گلاب چھڑکتے تھے مگر موت کی تپش تھی کسی طرح ٹھنڈی نہ ہوتی۔ شیر شاہ بار بار فتح کی خبر پوچھتا تھا۔ آخر کسی نے فتح کی خوشخبری سنائی۔ اس نے الحمد للہ کہا اور خود طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ ہزاروں حسرتیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں۔ شیر شاہ کا مقبرہ سہسرام میں ہے۔ نہایت عمدہ اور خوشنما عمارتوں میں اس کا شمار ہے۔ افغان عہد کی ہنرمندی کا کامل نمونہ ہے۔

(مصنفہ احمد [illegible])

سوالات

۱۔ [illegible]

۲۔ شیر شاہ [illegible] کس طرح ملی؟

۳۔ شیر شاہ [illegible] کھیل دیا؟

۴۔ [illegible]

۵۔ [illegible] شیر شاہ [illegible] کا [illegible] کیا پہنچا؟

۶۔ [illegible] شیر شاہ [illegible] کیا؟

۷۔ [illegible] کیا آتا ہے؟

۸۔ شیر شاہ [illegible] سلطنت کب اور کیسے [illegible]؟

۹۔ شیر شاہ [illegible] سلطنت [illegible]؟

۱۰۔ اٹاوہ کے ایک مقدمۂ قتل کی بابت علاقہ شیر شاہ نے کس تدبیر سے معلوم کی تھی؟
۱۱۔ شیر شاہ کے عہد حکومت میں مالگزاری کے وصول کرنے کا کیا رواج تھا؟
۱۲۔ عہدہ داران مندرجہ ذیل کے فرائض بیان کرو۔
قانونگو۔ امیر۔ شقدار۔ خزانچی۔ ہندی نویس اور فارسی نویس کارکن۔ صدر شقدار۔ صدر الصدور
اور عامل۔
۱۳۔ شیر شاہ کو دشمن کے ملک میں ہر قسم کی رسد کیوں ملجاتی تھی اور اس ملک میں کبھی قحط اور گرانی کی شکایت نہونے کے کیا اسباب تھے؟
۱۴۔ سوداگروں اور مسافروں کے ساتھ شیر شاہ کا قانون کیا تھا؟
۱۵۔ علاء الدین خلجی اور فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں فوج کی تنخواہوں کا کیا طریقہ تھا؟ اور شیر شاہ نے اُس میں کیا ترمیم کی تھی؟
۱۶۔ شیر شاہ نے کون کون قلعے تعمیر کرائے؟
۱۷۔ شیر شاہ کی خیرات اور امورات رفاہ عام کی نسبت کیا جانتے ہو؟
۱۸۔ شیر شاہ کی چار بڑی سڑکوں کا حال بیان کرو؟
۱۹۔ دہلی میں شیر شاہ کی کون کون یادگاریں موجود ہیں؟
۲۰۔ شیر شاہ کی وفات کب کہاں اور کیونکر واقع ہوئی اور اُس کے مقبرے کی نسبت کیا جانتے ہو؟

اطاعت

سب سے زیادہ ضروری سبق جو طفولیت میں حاصل کرنا چاہیے وہ اطاعت ہے۔ اور اس کے یہ معنی ہیں کہ جب ہم سے زیادہ لائق اور قابل رائے ہم کو راستہ بتلائے تو ہم اپنی رائے کو چھوڑدیں اور اُس کی پیروی کریں۔ اطاعت کا یہ مادہ سوسائٹی میں متحدہ طور پر کام کرنے کی بُنیاد ہے۔ عموماً جو قواعد مقرر کیے جاتے ہیں وہ عوام کی بھلائی اور بہبودی

کے لیے ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ کسی خاص شخص کی شرکت قواعد اور قانون بنانے میں نہو الّا مدنی حالت میں امن جبھی رہیگا جب ہر شخص اپنے فرمانروا۔ اپنے حاکم۔ اپنے بڑے کا کہا مانے۔ آزادی صرف اس قدر جائز ہے جہاں تک کسی شخص کی ذاتیات سے متعلق ہے۔ لیکن اگر تمدن میں آرام مطلوب ہے اور سوسائٹی میں سکون اور باقاعدگی درکار ہے تو کوئی شخص اُن بندشوں سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ جو اُس کو اتحاد اور وحدانیت کے رشتہ میں جکڑتی ہے۔ اور جو شخص سوسائٹی میں زیادہ ممتاز ہے وہی زیادہ پابند اور مطیع ہے کیونکہ وفادارانہ اطاعت اِس کے لیئے نہ صرف فرض ہے بلکہ اُس کی محافظ بھی ہے۔

حکومت کرنے کو دل تو سب کا چاہتا ہے مگر جو لوگ اطاعت کے خوگر نہیں ہوتے وہ عمدہ حاکم بھی نہیں بنتے۔ اور جو ٹھیک ٹھیک اطاعت کرنا جانتے ہیں وہ ٹھیک ٹھیک حکومت بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ غیر مطیع شخص یہ نہیں جانتا کہ حکومت کی حد کیا ہے۔

اطاعت میں سب سے اوّل حق والدین اور قریبی رشتہ داروں کا ہے۔ اور اِسی سبب سے گھر اطاعت سکھانے کا پہلا مدرسہ ہے۔ والدین خواہ بلحاظ مرتبت اور خواہ بلحاظِ عمر وتجربہ اولاد پر بزرگی رکھتے ہیں۔ لہذا اولاد کو اُن کی اطاعت لازم ہے۔ اور والدین کا فرض ہے کہ صرف اُن کو پرورش ہی نہ کریں بلکہ ملکۂ اطاعت اولاد میں پیدا کریں۔ تاکہ وہ آیندہ سوسائٹی کے بکار آمد ممبر اور مالک اور قوم کے لئے بہترین نعمت ہوں۔

اگر اولاد اپنے بزرگوں کا کہا نہ مانے۔ اُن کی شکر گزار نہو۔ اگر

مدد سے بغیر کسی تکلیف اور مشقت کے انجام دے سکتا ہے۔

جس طرح ہر ایک انسان آسانی سے فضول خرچی کی عادت ڈال لیتا ہے اسی طرح اگر وہ چاہے تو کفایت شعاری کا عادی بن سکتا ہے۔ ایک حکیم کے اقوال کفایت شعاری کے متعلق ایسے مفید اور کارآمد ہیں کہ اُن پہ ہر شخص کو غور کی نظر ڈالنی چاہیے۔ ہم اُن میں سے بعض اقوال اِس مقام پر درج کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے اگر تم دولت کی قدر و قیمت معلوم کرنی چاہتے ہو تو اُس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ تم کسی سے قرض لو۔ اِس تجربہ سے تم یہ جان جاؤ گے کہ جو شخص کسی سے قرض لیتا ہے وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ اگر تم اپنے سودا اور کے مقروض ہو تو اقرار کرو کہ تم اُس کے غلام ہو۔ ہر ایک روپیہ جو تم اپنے ہمسایہ سے قرض لیتے ہو وہ تمھاری ذاتی شرافت اور آزادی کی قیمت ہے۔ جس کے عوض میں تم نے اِس شرافت اور آزادی کو دوسرے کے ہاتھ گروی کر دیا ہے۔ افلاس انسان کی دلیری اور آزادی کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ غور کرو کہ خالی تھیلی جس میں روپیہ نہیں ہے فرش پہ سیدھی کھڑی نہیں ہو سکتی۔

اگر تم جانتے ہو کہ جو شخص قرض لیتا ہے وہ اُس قرض دینے والے کا غلام ہو جاتا ہے تو میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ اِس لعنت کے طوق سے اپنی گردن بچاؤ۔ اور اپنی آزادی پر داغ نہ آنے دو۔ اور دُنیا کا ہر ایک ادنٰے سے ادنٰے کام جو تم سے ہو سکے اختیار کر لو۔ پھر کفایت شعاری کا خیال رکھو۔ اس سے تمھاری آزادی

برقرار رہیگی۔ اور تم کسی کے غلام نہیں ہوگے۔

اگر تم اپنا خرچ اپنی آمدنی سے کم رکھ سکتے ہو تو تم سمجھ لو کہ پارس کا پتھر تم نے حاصل کر لیا۔ عرب کی مشہور مثل ہے کہ قرض محبت کی قینچی ہے اس کے سچ ہونے میں کیا شک ہے۔ میرے عزیز نوجوانو! اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا کے لوگ تم سے محبت کریں اور تم ان سے محبت کرو تو خبردار اس قینچی کو ہاتھ میں نہ لینا۔ کیونکہ اس سے محبت کا رشتہ بہت آسانی سے کٹ جاتا ہے۔

چین کی کہاوت ہے کہ قرض عزت کی درانتی ہے۔ اس کے سچ ہونے میں ذرا شبہ نہیں۔ میرے عزیزو! اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا کے آدمی تم کو عزت کی نظر سے دیکھیں اور تم ان کے ساتھ عزت سے پیش آؤ۔ تو بھولے سے بھی اس درانتی کو نہ پکڑنا۔ کیونکہ اس سے عزت کی کھیتی کٹ کر ڈھیر ہو جاتی ہے

(مولوی سید وحیدالدین سلیم)

سوالات

۱۔ آدمی دولتمند کس صورت میں بن سکتا ہے؟

۲۔ دانشمند اور عاقبت اندیش لوگوں کو دولت جمع کرنے میں کیا خصوصیت ہے؟

۳۔ حکیم نے کام اور محنت پر کفایت شعاری کو کیوں ترجیح دی ہے؟

۴۔ ثابت کرو کہ دولت کمانے سے اس کا بچانا بہتر ہے؟

۵۔ انسان فضول خرچی چھوڑ کر کفایت شعاری کا عادی کیونکر بن سکتا ہے؟

۶۔ قرض کے نقصانات بیان کرو؟

۷۔ قرضدار کو قرضخواہ کا غلام ہونا مصنف نے کس دلیل سے ثابت کیا ہے؟

۸۔ اہل عرب نے قرض کو محبت کی قینچی کیوں کہا ہے اور مصنف اس قینچی سے بچنے کی کیوں ہدایت کرتا ہے؟

۹۔ چینی لوگ قرض کو عزت کی درانتی کیوں کہتے ہیں؟

بیہودہ مشاغل ہی سے بچ جائینگے۔ بیہودہ جذبات ہی رک جائینگے کسی قدر افکار ہی سے ہلکے ہوجائینگے۔ اور طبیعت کو سکون نصیب ہوجائیگا۔

روپیہ پاس ہوتا ہے تو طبیعت میں عجب استغنا اور بے فکری کی کیفیت ہوتی ہے۔ اور بڑھاپے میں یا معذوری کے وقت عزت بنی رہتی ہے۔ اور طبیعت کو بھی اطمینان ہوتا ہے کہ اولاد ہمارے اندوختہ سے متمتع ہوگی۔ دنیا میں جس قدر تہذیب پھیلی یہ کفایت شعاری اور اندوختہ کی بدولت ہے۔ کیونکہ کفایت شعاری سے راس المال حاصل ہوا۔ اور راس المال سے اشیا پیدا کرنے کی قوت ہوئی کفایت شعاری کی عادت بعض لوگوں میں قدرتی ہوتی ہے۔ لیکن اکثروں کو اکتسابی طور پر حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اور اس کے لیئے ضرور ہے کہ انسان کو آیندہ کی آسایش اور آرام کے لیئے موجودہ وقت کی تھوڑی سی غیر ضروری خواہش کو روکنا پڑے۔ یہی حال اُن قوموں کا ہے جو اپنی تمام پیداوار خرچ کرڈالتی ہیں اور کچھ نہیں بچاتیں۔ اُن کے پاس بالکل راس المال نہیں ہوتا۔ اور وہ ذرا ذراسی چیزوں کے لیے دوسروں کی دست نگر ہوتی ہیں۔ اُن میں افلاس اور مصیبت پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ اور بے مائگی کی وجہ سے وہ تجارت بھی نہیں کرسکتیں نہ اُن کے پاس جہاز ہوتے ہیں۔ نہ ریل نہ کشتیاں بلکہ جو قومیں کفایت شعار ہیں وہ آج دُنیا کی تہذیب کا چشمہ اور دولت کا مخزن بنی ہوئی ہیں۔

کسی مُلک میں افلاس دو وجہ سے پھیلتا ہے۔ اوّل روپیہ کی احتیاج۔ دوم روپیہ کا بیجا صرف۔ اور بڑی ضرورت صرف کی ہے۔

روپیہ پیدا کرنا تو مشکل ہے لیکن اُس کو سلیقہ سے صرف کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ جو شخص اپنے قوتِ بازو سے اِس قدر پیدا کرلیتا ہے کہ اُس کی احتیاج کو کافی ہو۔ اور کچھ پس انداز ہو جائے تو یہ اندوختہ خواہ کسی قدر تھوڑا کیوں نہ ہو اُس سے اُس کی اور کُل گھر کی معاشرت کی بہبودی پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اور یہی اندوختہ اُس آزادی کو قائم رکھتا ہے۔ جس شخص کو خدا نے معمولی عقل بھی دی ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ جو کچھ ہے روز کا روز صرف کردینا عاقبت اندیشی کے بالکل خلاف ہے۔

جس شخص کو معقول تنخواہ مِلتی ہو۔ یا جس کی آمدنی معقول ہو وہ مرتے وقت کچھ نہ چھوڑے اور اُس کی بیوی بچّے محتاج اور بے سہارے رہجائیں۔ یا اُن کے سر پر متوفی کے قرض کا بار پڑے تو سوائے اِس کے کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ ناعاقبت اندیش تھا۔ یا اس قدر خود غرض تھا کہ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے آگے اُسے کسی بات کی پرواہی نہ تھی۔ ایسے لوگ اپنی آزادی ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت کرڈالتے ہیں۔ اور خود نمائیشی سامانوں کے پیچھے محتاج ہو جاتے ہیں پرہیزگاری۔ آزادی۔ دیانت داری۔ خود داری۔ وغیرہ اوصاف کفایت شعاری سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہ ایسے اوصاف ہیں جو انسان کے اخلاق کی بنیاد ہے اور خودداری کا یہ تقاضا ہے کہ اِنسان اپنی وضع کو نبھائے اور اپنا بار خود اُٹھائے۔ اور اِسی میں اُس کی عزّت ہے۔ اور اگر دوسروں پہ اپنا بوجھ ڈالیگا تو حقیقی عزّت و آرام سے نہیں رہ سکتا۔

کیونکہ ہر شخص کو اپنی حاجتوں کا جس قدر احساس ہوتا ہے دوسرے کو
نہیں ہوتا۔ اسی طرح اپنے دل کی امید۔ اپنی پسند کا اثر جس طرح
خود اپنے اوپر ہوتا ہے دوسروں کو اس کی پروا بھی نہیں ہوتی
اس لیے ہر شریف شخص کا فرض ہے کہ اپنی آیندہ حاجتوں کا
خیال رکھے۔ اور چادر دیکھکر پاؤں پھیلائے۔ غریب ہونا عیب
نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ افلاس بہت سے نیک کام
نہیں ہونے دیتا۔ اطمینان اور سکون خاطر کو برباد کرکے خوشیوں
پر پانی پھیر دیتا ہے۔

کفایت شعاری کے اصول کچھ مشکل نہیں ہیں اور ہر شخص
ان کو سمجھ سکتا اور ذرا سے انتظام سے ان پر عمل کر سکتا ہے۔ اول
تو یہ کہ آمدنی کا تھوڑا سا حصہ (خواہ کتنا ہی تھوڑا کیوں نہ ہو) آیندہ
کی حاجتوں کے لیے جمع کیا جائے۔ دوسرے جو کچھ خریدا جائے۔ اس کی
قیمت نقد ادا کر دی جائے۔ اور قرض کے جھگڑے سے پرہیز کیا جائے
تیسرے یہ انتظام کیا جائے کہ کوئی چیز قرض لینے کی ضرورت نہ ہو
چوتھے [illegible] اٹھایا جائے [illegible] اس کے نفع و نقصان کو
اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اور جس کا نفع یقینی ہو اسی پر روپیہ
صرف کیا جائے۔ پانچویں آمد و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھا جائے
[illegible] جو چیز خریدی جائے اس کو احتیاط سے استعمال کیا جائے اور
[illegible] کہ نوکروں اور لڑکوں [illegible] بے پروائی اور غفلت سے
[illegible] چیزیں ٹوٹ کر خراب نہ ہوں اور گھر کی چیزیں اسی طرح
[illegible] ان کے [illegible]

کام کی بات

سب سے بڑی غلطی جو تم کرتے ہو یہ ہے۔ کہ جو کام تمہارے سپرد کیا جائے۔ اُس کی نسبت یہ خیال تمہارے دل میں پیدا ہو کہ تم یہ کام کسی اور کے فائدے کے لیے کر رہے ہو۔ اس لیے تم کو اُس کام میں دل لگا کر محنت نہیں کرنی چاہیے۔ دُنیا میں بس ایک ہی چیز ہے جو تم کو فائدہ پہونچا سکتی ہے اور جس سے تمہاری حالت کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور جس پر تمہاری ترقی کا دار مدار ہے اور جو تم کو ادنیٰ درجے سے نہایت بلند درجے پر پہونچا سکتی ہے وہ چیز تمہاری محنت اور کوشش ہے۔ تم دُنیا میں زندگی شروع کرتے ہو۔ اور عقلی و جسمانی قوتیں تمہارے اندر موجود ہیں۔ اُن عقلی اور جسمانی قوتوں کے لیے ایک حالت میں رہنا ضرور ہے۔ یا تو یہ ترقی کریں اور نشوونما پائیں یا تنزل کریں اور کمزور ہو جائیں۔ اور ان دونوں حالتوں کا انحصار خود تمہاری ذات پر ہے۔

ہر ایک کام جو تم کرتے ہو کیسا ہی ادنیٰ و حقیر ہو تمہاری ذات کے لیے فائدہ مند ہے۔ لیکن اگر تم اُس کام کو سرسری جانو اور اُس کے انجام دینے میں غفلت کرو تو اُس سے تمہاری ذات کو نقصان پہونچیگا بلاشبہ ہر ایک کام جو چستی اور ایمانداری سے انجام دیا جائے کام کرنے والے کے حق میں فائدہ مند ہے۔ اور اُس کو ترقی اور کامیابی پر پہنچاتا ہے۔ فرض کرو کہ تمہارا فرض یہ ہے کہ تم کسی دفتر کے کمرے کو ہر روز صاف رکھو تو اب تم کو لازم ہے کہ ہر صبح عین وقت پر دفتر کے وقت سے پہلے وہاں پہونچو۔ اور پوری محنت اور توجہ اور ایمانداری

سے اپنا کام انجام دو اور کمرے کو صاف کرو۔ اور اُس کی صفائی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھو۔ اور خیال کرو کہ شاید ایسی ہی ایمانداری سے ایک روز تم کو کسی شہر کی حکومت کا کام انجام دینا پڑے۔

کوئی کام ہو اُس کو محنت اور جفاکشی کے ساتھ انجام دینے سے تم اپنی لیاقتوں کو ترقی دے سکتے ہو۔ جو لوگ آج سے پہلے کامیابی اور ترقی کی بلندیوں پر پہونچ چکے ہیں۔ اگر اُن کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو جائیگا کہ اُنھوں نے جس کام پر ہاتھ ڈالا۔ اور جو کام اُن کے سپرد کیا گیا اُس کو اُنھوں نے نہایت محنت اور پوری توجّہ اور ایمانداری اور ہوشیاری سے انجام دیا۔

تمام رات اور تمام دن کام میں مشغول کبھی نہیں رہنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے تمہاری جسمانی اور روحانی طاقتوں کو نقصان پہونچتا ہے۔ اور تمہاری قدرتی لیاقت اور ادبی قابلیت کے سرمایہ میں کمی آتی ہے۔

یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جو کام کسی نے تمہارے سپرد کیا ہے اُس کے انجام دینے میں غفلت کرو۔ اور اپنے نفس کو سہل انکاری اور غفلت شعاری کا عادی بناؤ۔ تم کو یہ خیال رکھنے کہ تمہاری کوتاہی اور غفلت سے کسی اور کو نقصان پہونچتا ہے۔ پس آقا کے کام میں ایمانداری اور دیانتداری کے سوا اور کوئی خیال تمہارے دل میں نہیں آنا چاہیئے

(مولوی سید وحید الدین سلیم)

سوالات

۱۔ تم اپنے ذمّے سپرد کیے ہوئے کام کے متعلق سب سے بڑی غلطی کیا کرتے ہو؟

۲۔ محنت اور کوشش کا فائدہ خاص کیا ہے؟
۳۔ تمہاری عقلی اور جسمانی قابلیتیں تمہاری ذات پر کس طرح منحصر ہیں؟
۴۔ ثابت کرو کہ ہر ادنےٰ کام بھی فائدہ مند ہوتا ہے لیکن اگر اُسے حقیر سمجھا جاوے تو وہی نقصان پہونچاتا ہے؟
۵۔ ثابت کرو کہ ہر چھوٹے کام کا بھی انجام دینا اسی قدر ضروری ہے جتنا کہ ایک بڑے کام کا؟
۶۔ ہر کام کے انجام دینے کے لیے محنت اور جفاکشی کیوں ضروری ہے؟
۷۔ دن رات برابر کام کرتے رہنا کیوں بُرا ہے؟
۸۔ کام میں غفلت کرنا کیوں مذموم ہے؟

مصر کی قدیم یادگاریں

آثار قدیمہ کے لحاظ سے کوئی شہر اس شہر کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ سچ یہ ہے کہ یہاں کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی تاریخ ہے۔ سواد شہر کے ویرانوں میں اس وقت تک سیکڑوں خذف ریزے ملتے ہیں جن پر کئی کئی ہزار سال قبل کے حروف و نقوش کندہ ہیں۔ مجھکو اتنا وقت بلکہ سچ یہ ہے کہ اتنی ہمت کہاں تھی کہ تمام قدیم یادگاروں کی سیر کرتا۔ البتہ چند مشہور مقامات دیکھے اور اُنھیں کے حال کے اوپر اکتفا کرتا ہوں۔

اہرام۔ یہ وہ قدیم مینار ہیں جن کی نسبت عام روایت ہے کہ طوفان نوح سے پہلے موجود تھے۔ اور اس قدر تو قطعی طور سے ثابت ہے کہ یونان کی علمی ترقی سے ان کی عمر زیادہ ہے۔ کیونکہ جالینوس نے اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مینار نہایت کثرت سے تھے۔ یعنی دو دو دن کی مسافت میں پھیلے ہوئے تھے۔ صلاح الدین کے

زمانے میں اکثر ڈھائے گئے ان میں جو باقی رہ گئے ہیں اور جن پر خاص طور سے اہرام کا اطلاق ہوتا ہے صرف تین ہیں جو سب سے بڑا ہے اُس کی لمبائی چار سو اسی فیٹ یعنی قطب صاحب کی لاٹ سے دوگنی ہے۔ نیچے کے چبوترے کا ہر ضلع سات سو چونسٹھ فیٹ ہے۔ مینار کا مکعب آٹھ کروڑ نوے لاکھ فیٹ ہے۔ اور وزن اڑسٹھ لاکھ چالیس ہزار ٹن ہے اس کی تعمیر میں ایک لاکھ آدمی بیس برس تک کام کرتے رہے۔ جڑیں بیس بیس فیٹ لمبی اور پانچ پانچ فیٹ چوڑی پتھر کی چٹانیں ہیں اور چوٹی پر جو چھوٹی سے چھوٹی ہیں آٹھ فیٹ کی ہیں۔ اُس کی شکل یہ ہے کہ ایک نہایت وسیع مربع چبوترہ ہے اس پر ہر طرف سے کسی قدر سطح چھوڑ کر دوسرا چبوترہ ہے۔ اسی طرح چوٹی تک اوپر تلے چبوترے ہیں۔ اور ان چبوتروں کے بتدریج چھوٹے ہوتے جانے سے زینوں کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ تعجب ہے کہ پتھر کو اس طرح وصل کیا ہے کہ جوڑ یا درز کا معلوم ہونا ایک طرف۔ چونہ یا مصالحہ کا بھی اثر نہیں معلوم ہوتا۔ اس پر استحکام کا یہ حال ہے کہ کئی ہزار برس ہو چکے اور جوڑوں میں بال برابر فصل نہیں پیدا ہوا ہے۔ ان میناروں کو دیکھ کر خواہ مخواہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جر ثقیل کا فن قدیم زمانے میں موجود تھا۔ کیونکہ اس قدر بڑے بڑے پتھر اتنی بلندی پر جر ثقیل کے بغیر چڑھائے نہیں جا سکتے اور اگر اس ایجاد کو زمانۂ حال کے ساتھ مخصوص سمجھیں تو جر ثقیل سے بھی بڑھ کر کسی عجیب صنعت کا اعتراف کرنا پڑیگا۔

ان میناروں میں جو ایک سب سے چھوٹا ہے کسی قدر خراب

ہو گیا ہے جس کی کیفیت یہ ہے۔ ۵۹۳ھ میں ملک عزیز پسر سلطان صلاح الدین نے بعض احمقوں کی ترغیب سے اسے ڈھانا چاہا۔ چنانچہ دربار کے معزز افسر اور بہت سے نقب زن اور سنگتراش اور مزدور اس کام پر مامور ہوئے۔ آٹھ مہینے تک برابر کام جاری رہا اور نہایت سخت کوششیں عمل میں آئیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے برباد کر دیئے گئے۔ لیکن بجز اس کے کہ اوپر کی استرکاری خراب ہوئی یا کہیں کہیں سے ایک آدھ پتھر اکھڑ گیا اور کچھ نتیجہ نہ ہوا۔ مجبور ہو کر ملک العزیز نے یہ ارادہ چھوڑ دیا۔

اہرام کے قریب ایک بڑا بت ہے جس کو یہاں کے لوگ ابوالہول کہتے ہیں۔ اس کا سارا دھڑ زمین کے اندر ہے۔ گردن اور سر اور منہ کھلے ہوئے ہیں۔ چہرے پر کسی قسم کا سرخ روغن ملا ہے جس کی آب اس وقت تک قائم ہے۔ ان اعضا کی مناسبت سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ پورا قد ساٹھ ستر گز سے کم نہ ہوگا۔ باوجود اس غیر معمولی بڑائی کے تمام اعضا ناک کان وغیرہ اس ترتیب اور مناسبت سے بنائے ہیں کہ اعضا کے باہمی تناسب میں بال برابر فرق نہیں۔ عبداللطیف بغدادی سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ نے دنیا میں سب سے عجیب تر چیز کیا دیکھی۔ اس نے کہا کہ ابوالہول کے اعضا کا تناسب۔ کیونکہ عالم قدرت میں جس چیز کا نمونہ موجود نہیں اس میں ایسا تناسب قایم رکھنا آدمی کا کام نہیں

(شبلی نعمانی)

سوالات

اہرام کی قدامت کے متعلق مصنف نے کیا لکھا ہے؟

۲- اہرام کی تاریخ کی نسبت کیا جانتے ہو اور جالینوس نے اپنی تصنیف میں اس کے متعلق کیا تحریر کیا ہے؟
۳- صلاح الدین کے عہد میں اہرام پر کیا کیا حوادث گذرے؟
۴- اہرام کے عرض و طول و ارتفاع اور وزن کی مقداریں تحریر کرو؟
۵- جرّ ثقیل کسے کہتے ہیں؟
۶- اہرام کے سب سے چھوٹے مینار کی نسبت کیا جانتے ہو؟
۷- ابوالہول کیا ہے اس کی نسبت جو کچھ جانتے ہو مفصّل تحریر کرو؟

رقعات منشی غلام غوث بیخبر

نواب غلام دستگیر خاں بہادر حیدر آبادی کے

خط کا جواب

وہ شبہ حسن کرے یاد فقیر زار کو [illegible] تم سے دیکھو مجھے دیکھو یہ عنایت دیکھو
مفلس کو خزانہ ملنے سے ایسی تقویت۔ بیمار کو صحت ہونے سے اتنی مسرت پیاسے کو پانی پانے سے یہ فرحت نہ ہوتی ہوگی۔ جو سب مجھے عنایت نامہ کے ورود سے ہوئی۔ ہر چند مجھ پر ایسے اور اتنے زمانے بے جا بے گذرے ہیں کہ میری عید تحرم سے زیادہ غم افزا ہوتی ہے مگر جس عید کی آپ مبارکباد دیں وہ بیشک میرے لیے سعید ہے تسلیم بجا لاکر سر گریباں ہوں کہ میں کیا پیش کروں فقیر کی بساط میں سوا دل و جان کے اور تھا ہی کیا۔ اُن میں سے ایک تو خون ہو کر آنکھوں سے بہہ گیا دوسری بجز اس کے کہ ملک الموت کے حوالے کردوں کسی حقیقت کی نہیں۔ مرزا نجف بیگ جو التماس [illegible]

اسی کو نذر کروں یا نثار کروں۔ بس یہی ایک چیز ہے جس سے اپنے آپ کو یوسف کے خریداروں میں شمار کروں وہی شب و روز وردِ زبان اور تسبیح دل و جان ہے۔ مصرع۔ تم سلامت رہو قیامت تک ﴿ آپ کی کمال قدردانی ہے کہ آپ نے عید کی محفل میں میری تصویر کو جگہ دی وہ تو اس قابل ہے کہ محرّم میں کسی ماتم کدہ میں رکھدیجائے اور اُس پر لکھدیا جائے کہ غم کی تصویر۔ خدا کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ نصیب دشمناں مزاج کی کلفت سُننے کا رنج نہ اُٹھایا اور مژدۂ عافیت سنے راحت پائی۔ خدا کرے وہ علالت دولتِ صحت کی زکوٰۃ ہو۔ اور اُس ادا سے اس کی افراط ہو۔

سوالات

۱۔ مصنّف نے مکتوب الیہ کے خط پہونچنے کی خوشی کو کن کن تمثیلوں سے ظاہر کیا ہے؟
۲۔ کاتب نے اپنے دل و جان کی نسبت کیا لکھا ہے؟
۳۔ مصنف نے اپنی تصویر کی نسبت کیا ذکر کیا ہے؟
۴۔ عبارت ذیل کی تشریح کرو۔
خدا کرے وہ علالت دولت صحت کی زکوٰۃ ہو اور اُس ادا سے اس کی افراط ہو۔

مرزا نثار علی بیگ صاحب کے نام

مخدوم میرے کل میں نے چھوٹے میاں سے آپ کے والد ماجد کے انتقال کرنے کا حال سُنا اور ہر طرح سے رنج ہوا۔ عموماً اس نظر سے کہ زمانہ آدمیوں سے جو بہت تھوڑے رہ گئے ہیں خالی ہوتا جاتا ہے اور وہ وقت نہیں کہ اب ایسے لوگ پیدا ہوں۔ اور خصوصاً اس راہ سے کہ آپ پر بڑا صدمہ ہوا دوست کا رنج اپنے رنج سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ ہرچند جانتا ہوں کہ بفضلہ آپ دل دانا اور

چشم بینا رکھتے ہیں۔ مگر غم کا طاری ہونا بھی ایسے مصائب ہیں اِس عالم کا مقتضا ہے۔ جب تک یہاں ہیں اُس سے بچ نہیں سکتے ہاں جو خیال کسی قدر دل کو تسکین دے اور اُس درد کی دوا کرے وہ یہ ہے کہ ہستی حقیقی کو کسی کی فنا نہیں۔ کسی عالم اور کسی عنوان میں ہو جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ اور جیسا ہے ویسا رہیگا۔ رہی مفارقت چند روزہ ایک کو دوسرے سے جو دل و جگر کو خون کرتی ہے الحمد للہ کہ وہ بھی دائمی نہیں۔ ایک دن ہم بھی وہیں جا پہونچینگے۔ جہاں پچھلے گئے اور اگلے جائینگے۔ شعر

کس بقی نرود کسے بدنبال — آخر ہمہ را ہمیں بود حال

خداوند تعالےٰ آپ کو اپنی حقیقت میں ایسا محو رکھے کہ اعتبارات کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ ملے۔ اور جناب مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آپ کی عمر بڑھائے اور آپ کی ذات سے اُن کا نام روشن کرے۔ آمین۔

سوالات

۱۔ کاتب نے تلقین صبر کے لیے کیا فاضلانہ مسئلہ لکھا ہے؟

۲۔ شعر مندرجہ خط کا مطلب بیان کرو؟

۳۔ کاتب نے مکتوب الیہ اور مرحوم کے لیے کیا کیا دعائیں دی ہیں؟

منشی عبد الجلیل صاحب تحصیلدار کے نام

گرامی منش ذرا غور تو کیجیے شاید یاد آجائے کہ الہ آباد میں غلام غوث نامی ایک فقیر آپ کا ملاقاتی رہتا ہے۔ اگر یاد آگیا تو اُسے اپنی خیریت سے مطلع کیجیے کہ بہت دنوں سے جو آپ کی کچھ

خبر اس کو نہیں ملی وہ پریشان رہتا ہے۔ ہر چند اُسے سمجھایا کہ یہ زمانہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی کسی کو یاد کرے مگر اس کو تو اپنے ملنے والوں کی خیریت کے جویا رہنے کا مرض ہے وہ کب سنتا ہے اور غور کے بعد بھی یاد نہ آئے تو جانے دیجئے حس کم جہان پاک فقط

سوالات

۱۔ کاتب نے شکایت عدم تحریر خطوط کو کس نازک پیرائے میں ظاہر کیا ہے؟

شیخ رفعت علی صاحب رفعت کے نام

مخدوم مجھے اور آپ سے ملال۔ استغفر اللہ۔ یہ تو ایسا محال ہے جیسا آب حیات سے تشنوں کا نکلنا یا شعلوں سے آب حیات کا اُبلنا۔ بشریت ہے بفرض محال آپ سے کوئی بات سن کی موجبِ رنج ہو تا غصہ ہونگا۔ شکایت کرونگا اور پھر صاف ہو جاؤنگا نہ یہ کہ سکوت کروں اور رنجیدہ جاؤں اور محبت سے ہاتھ اٹھاؤں یہ طرح ملنے کے اور لوگ ہیں نہ کہ آپ۔ آپ کو میں اپنا عزیز جانتا ہوں۔ اُس پر آپ کا خلوص محبت۔ آپ کا شیوۂ انکسار آپ کی سنجیدگی آپ کی متانت بھلا ایسی ہے کہ کسی کو آپ سے رنج ہو اور پھر بالخصوص مجھ کو۔ میرے نزدیک محبت ایسی چیز نہیں ہے کہ بعد حاصل ہونے کے اتنی سی بات میں رائیگاں کر دی جائے۔ اور پھر کوئی بات بھی تو ہو۔ جواب خط کا بدیہ پہنچنا کوئی بات ہے۔ آپ ہر طور پر مطمئن رہئیے فقط

سوالات

۱۔ اپنے کسی دوست کو جس نے کتاب نہ ملنے پر تحریر کرکے تم سے رنجش

نہیں اور اُس کا طرزِ بیان اِس خط کے مشابہ ہو۔

نواب محسن الملک کے خط کا جواب

مخدوم میرے اِس فقیر گوشہ نشین کو جو مدت کے بعد پھر آپ نے یاد فرمایا۔ اُس کا شکریہ مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ جب آپ مجھے یاد نہیں فرماتے ہیں تو میں انصاف کرتا ہوں کہ کس لائق ہوں کونسا کام کسی کا مجھ سے نکلتا ہے۔ کیا میرے امکان میں ہے کہ کوئی مجھ سے ملے یا خط و کتابت رکھکر تضیع اوقات کرے۔ جب یاد کرتے ہیں تو شکر گذار ہوتا ہوں کہ کیا خلوص محبت ہے کہ بے غرض اور بے وجہ اس قدر التفات کرتے ہیں۔ اور پھر وہ اس انکسار سے جس سے میں شرماتا ہوں اور ہر حال میں دعاگو رہتا ہوں کہ حافظ حقیقی ہمیشہ ہر آفت سے محفوظ اور ہر مطلب میں کامیاب رکھے۔ تشریف لانے کے وعدے نے مشکور کیا۔ خدا راس لائے۔

سوالات

۱۔ کاتب نے اپنا انکسار کن الفاظ سے ظاہر کیا ہے؟

۲۔ شکر گزاری اور دعا کے لیے کس طرزِ بیان کو اختیار کیا ہے؟
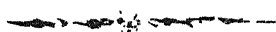
مثنوی گلزار نسیم

حمد

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر
حمد حق و مدحت پیمبر

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے
یعنی کہ مطیع پنجتن ہے

ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی
کرتا ہے زباں کی پیش دستی

داستان تاج الملوک

سرگرمِ زبانِ باستانی
یوں نقل ہے تازہ کی کہانی

پورب میں ایک تھا شہنشاہ
سلطان زین الملوک ذی جاہ

لشکر کش و تاجدار تھا وہ
دشمن کش و شہریار تھا وہ

خالق نے دیے تھے چار فرزند
دانا۔ عاقل۔ ذکی۔ خردمند

نقشہ ایک اور نے جمایا
پیری میں نہال تازہ آیا

تھا افسر خسرواں وہ گلفام
پایا تاج الملوک رکھ نام

مہرے سے نہ دایہ نے نکالا
پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا

جب نام خدا جواں ہوا وہ
مانند نظر رواں ہوا وہ

تھا شکارگاہ سے شاہ
نظارہ کیا پسر کو ناگاہ

مہر لب شہ ہوئی خموشی
کی دور بصر سے چشم پوشی

آنکھ جو شہ سے نہ دو نمائی
چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی

ہر چند کہ بادشہ نے ٹالا
اس ماہ کو شہر سے نکالا

گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور
آیا کوئی لے کے سرمۂ نور
تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور
ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے
تھا اک کھال پیر دیریں
وہ مرد خدا بہت کراہا
ہے باغ بکاؤلی میں اک گل
خورشید میں ہے ضیا کرن کی
اُس نے تو گلِ ارم بتایا
شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار
شاہانہ چلے وہ لے کے ہمراہ
وہ بادیہ گرد خانہ برباد
میداں میں خاک اُڑا رہا تھا
پوچھا تم لوگ کے خیل
بولا لشکر کا اک سپاہی
سلطان زین الملوک شہ زور
منظور علاج روشنی ہے
گل کی جو خبر سنائی اُس کو
ہمراہ کسی لشکری کے ہو کر
یک چند پھرا کیا وہ انبوہ
بلبل ہوئے سب بہار جی سے

خارج ہوا نورِ دیدۂ کور
لایا کوئی جا کے سرمۂ طور
بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور
مختار ہے جس طرح بنا ہے
عیسے کی تھیں اُس نے آنکھیں دیکھیں
سلطاں سے مِلا کہا کہ شاہا
پلکوں سے اُسی پہ مار جھنگل
ہے مہر گیا اُسی چمن کی
لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا
رُخصت کیے شہ نے چار ناچار
لشکر۔ اسباب۔ خیمے۔ خرگاہ
یعنی تاج الملوک ناشاد
دیکھا تو وہ لشکر آ رہا تھا
جاتے ہو کدھر کو صورتِ سیل
جاتی ہے ارم کو فوج شاہی
دیدار پسر سے ہو گیا کور
مطلوب گل بکاؤلی ہے
گلشن کی ہوا سمائی اُس کو
قسمت پہ چلا وہ نیک اختر
صحرا صحرا کوہ در کوہ
گل کا نہ پتا لگا کسی سے

وہ دامن دشت شوق کا خار — یعنی تاج الملوک دل زار
درویش تھا بندۂ خدا وہ — اللہ کے نام پہ چلا وہ
اک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد — صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد
سایے کو پتہ نہ تھا شجر کا — عنقا تھا نام جانور کا
مرغان ہوا کے ہوش راہی — نقش کف پا تھی ریگ ماہی
یہ دشت کہ جس میں تیز تگ دو — یا ریگ رواں تھی یا وہ رہرو
ڈانڈا تھا ارم کے بادشا کا — اک دیو تھا پاسباں بلا کا
کھوکھا کئی دن کا تھا وہ ناپاک — فاقوں سے رلا تھا پھانک کر خاک
حلوے کی پکا کے اک کڑھائی — شیرینی دیو کو چٹائی
کہنے لگا کیا مزہ ہے دلخواہ — اے آدمی زاد واہ وا واہ
چیز اچھی کھلائی تو نے مجھکو — کیا اس کے عوض میں دوں میں تجھکو
بولا وہ کہ پہلے قول دیجیے — پھر جو میں کہوں قبول کیجیے
گلزار ارم کی ہے مجھے دھن — بولا وہ ! ارے بشر وہ گلبن
خورشید کے ہم نظر نہیں ہے — اندیشہ کا واں گذر نہیں ہے
رہ جا ! مرا بھائی ایک ہے اور — شاید کچھ اس سے بن پڑے طور
قائل اس نے کہا کہ قول ہارا — ہے [illegible] یہ نوجواں ہمارا
مشتاق ارم کی سیر کا ہے — کوشش کرو کام خیر کا ہے
حمالہ نام دیونی ایک — چھوٹی بہن اس کی تھی بڑی نیک
خط اس کو لکھا باین عبارت — اے خواہر مہرباں سلامت
پیارا ہے مرا یہ آدمی زاد — رکھیو اسے [illegible]
انسان ہے چاہے کچھ جو سازش — مہمان ہے کیجیو [illegible]

باپ اس کا ہے اندھے پن سے مجہول — مطلوب بجا دلی کا ہے پھول
دل داغ اس کا پیداے گل ہے — نرگس کے لیے ہواے گل ہے
خطرے کے لشکر کو لے اڑا دیو — پہنچا حمالہ پاس بے ریو
بھائی کا جو خط بہن نے پایا — بھیجے ہوئے کو سگے لگایا
دیووں سے کہا کہ چوہے تن بجاؤ — تا باغ ارم سرنگ پہنچاؤ
سن حاجت نقب بہر گلگشت — کترا چوہوں نے دامن دشت
جب مہر تہ زمیں سمایا — اس نقب کی رہ وہ آدم آیا
کھٹکا جو نگاہبانوں کا تھا — دھڑکا یہی دل کا کہہ رہا تھا
گوشے میں کوئی لگا نہ ہووے — خوشہ کوئی تاکتا نہ ہووے
گو باغ کے پاسباں غضب تھے — خوابیدہ برنگ سبزہ سب تھے
پائی گے جو گلبنوں میں تھا گل — پہنچا لب حوض سے تہ پل
وہ دست استاد اثر کے لایا — پھولا نہ وہ جامے میں سمایا
گل لے کے بڑھا ایاغ برکف — چوری سے چلا چراغ برکف
گل ہاتھ میں مثل دست بیضا — اس نقب کی آستیں سے نکلا
گل لے کے جب آملا وہ گلچیں — اس نقب کی رخنہ بندیاں کیں
گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچۂ صبح کھکھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرش گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پر آپ وہ چشم جو نہ پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں؟ کدھر گیا گل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل

ہے ہے! مرا پھول لے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
پتوں میں سے پھول لے گیا کون
شبنم کے سوا چرانے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے
آنکھوں میں عزیز گل مرا تھا
گلچیں کا جو ہاتھ ٹوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے
لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
رنگ اس کا غرض لگا بدلنے
گل کا سا لہو بھرا گریباں
نہ کھلا کے کہا سمن پری کو
تھی لپٹی غبار سے بھری وہ
ہر باغ میں ٹہلتی پھری وہ
جس تختے میں مثل باد جاتی

ہے ہے! مجھے خار دے گیا کون
تو ہو کے گل اڑا نہیں ہے
بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون
اوپر کا تھا کون آنے والا
جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
پتلی وہی چشم حوض کا تھا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
گل تو ہی مہک سنگھا کدھر ہے
تھی سبزے سے راست مو بر اندام
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
سبزے کا سا تار تار داماں
اب چین کہاں بکاولی کو
آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ
ہر شاخ میں ڈھونڈتی پھری وہ
اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
پتا کہیں حکم بن ہلا ہے

(نسیم لکھنوی)

مثنوی میر حسن

سواری کی تیاری

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی
کھلی گل جھڑی غم کے جنجال کی

کہا شہ نے بلوا نقیبوں کو شام
کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام

سواری تکلف سے تیار ہو
مہیا کریں جو کہ درکار ہو

کریں شہر کو رل کے آئینہ بند
سواری کا ہو تکلف جس سے دو چند

رعیت کے خوش ہوں صغیر و کبیر
کہ نکلیگا کل شہر میں بے نظیر

یہ فرما محل میں گئے بادشاہ
نقیبوں نے سن حکم لی اپنی راہ

خوشی میں گئی جلد جو شب گزر
ہوئی سامنے سے نمایاں سحر

عجب شب تھی وہ جوں سحر روسفید
عجب روز تھا مثل روز امید

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو
کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو

ہوا جب کہ داخل وہ حمام میں
عرق آگیا اس کے اندام میں

تن نازنیں نم ہوا اس کا کل
کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل

نہا دھو کے نکلا وہ گل اس طرح
کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

غرض شاہزادے کو نہلا دھلا
دیا خلعت خسروانہ پنھا

نکل گھر سے جس دم ہوا وہ سوار
کیے خوان گوہر کے اس پر نثار

زبس تھا سواری کا باہر ہجوم
ہوا جب کہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم

برابر برابر کھڑے تھے سوار
شتر دول بھی تھے ہاتھیوں کی قطار

وہ ماہی مراتب وہ تخت رواں
وہ نوبت کہ دو طاکا جیسے سماں

وہ شہنائیوں کی صدا خوشنما — سہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا

وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی — قدم با قدم بالباسِ زری

سوار اور پیادے صغیر و کبیر — جلو میں تمامی امیر و وزیر

ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار — چلے سب قرینے سے باندھے قطار

سجے اور سجائے سبھی خاص و عام — لباسِ زری میں ملبّس تمام

غرض اس طرح سے سواری چلی — کہے تو کہ بادِ بہاری چلی

رعیت کی کثرت ہجوم سپاہ — گذرتی تھی رک رک کے ہر جا نگاہ

لگا تیغ سے تا ضعیف و نحیف — تماشے کو نکلے وضیع و شریف

نظر جس کو آیا وہ ماہِ تمام — کیا اس نے جھک جھک کے اس کو سلام

غرض شہر کے باہر اک سمت کو — کوئی باغ تھا شہ کا اس میں تھے وہ

سواری کو پہنچا گئی فوج ادھر — گئے اپنے منزل پہ شمس و قمر

پہر رات تک پہنے پوشاک وہ — رہا ساتھ سب کے طربناک وہ

تقاضا رادہ شب تھی شب چاردہ — بڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ

نقارے سے تھا اس کے دل کو سرور — عجب عالم نور کا تھا ظہور

عجب لطف تھا سیر مہتاب کا — کہے تو کہ دریا تھا سیماب کا

کچھ آئی جو اس مہ کے جی میں ترنگ — کہا آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ

ارادہ ہے سو کوٹھے پہ آرام کا — کہ بھایا ہے عالم شب ماہ کا

زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا — بچھونے پہ آتے ہی بس سو رہا

جہاں تک کہ چوکی کے تھے باریدار — ہوا جو چلی سو گئے ایک بار

شاہزادہ گم ہو گیا

کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں — تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں

نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہرو
نہ وہ گل ہے اس جا نہ وہ اسکی بو

نہ بن آئی کچھ اُن کو اِسکے سوا
کہ کہیے یہ احوال اب شہ سے جا

ہوا گم وہ یوسف چھپی یہ جو دھوم
کیا خادمانِ محل نے ہجوم

شب آدھی وہ جسطرح سوتے کٹی
رہی تھی جو باقی وہ روتے کٹی

عجب طرح کی شب تھی ہیہات وہ
قیامت کا دن تھا نہ تھی رات وہ

سحر نے کیا جب گریبان چاک
اُڑانے لگے مل کے سب سر پہ خاک

اُٹھا شہر میں سب طرف شور و غل
کہ غائب ہوا اِس چمن سے وہ گل

غم و درد سے دل جو سب کا بھرا
ہوا باغ سارا وہ ماتم سرا

وہ لبریز جو نہر تھی جا بجا
سو آنکھوں میں وہ رہگئی ڈبڈبا

ہوا حال چشموں کا یاں تک تباہ
کیا رخت پانی نے اپنا سیاہ

کہاں وہ کنوئیں اور کدھر آبشار
کوئی دل میں روئے کوئی دھاڑ مار

جہاں رقص کرتے تھے طاؤس باغ
لگے بولنے اُن منڈیروں پہ زاغ

منقش جہاں تھے وہ رنگیں مکاں
ہوئے سب وہ جوں دیدۂ خونچکاں

گلوں کی طرح کھل رہے تھے جو دل
سو وہ سب خزاں سے ہوئے مضمحل

نہ غنچہ نہ گل نے گلستاں رہا
فقط دل میں اک خارِ ہجراں رہا

وزیروں نے دیکھا جو احوال شاہ
کہ ہوتی ہے اب اسکی حالت تباہ

کہا گو جدائی گوارا نہیں
ولیکن خدائی سے چارہ نہیں

خدا کی خدائی تو معمور ہے
غرض اُس کے نزدیک کیا دور ہے

یہ کہہ اور شہ کو بٹھا تخت پہ
بہر نوع رہنے لگے تک و دگر

لُٹایا بہت باپ نے مال و زر
ولیکن نہ پائی کچھ اُس کی خبر

شادی کا سماں

بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز — چڑھا بیاہنے وہ مہِ شب فروز
محل سے نکل جب ہوا وہ سوار — بجے شادیانے بہم ایک بار
کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا — کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
سپاہی اور تیغے کھڑکنے لگے — سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے
نکورے وہ نوبت کے اور انکے بعد — گرجنا وہ دھوسوں کا مانندِ رعد
دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے — چہکنے خوشی سے غزلخواں ہوئے
براتی ادھر اور ادھر جوق جوق — وہ آوازِ سرنا وہ آوازِ بوق
وہ ابرک کی ٹٹی وہ مینے کے جھاڑ — کئے توڑ تنکے کی اوجھل پہاڑ
دو رستہ برابر برابر وہ تخت — کسی پر کنول اور کسی پر درخت
اناروں کا دغنا چھٹنے کا زور — ستاروں کا چھٹنا پٹاخوں کا شور
وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار — ہر اک رنگ کی جس سے دونی بہار
جب آئی وہ دولھن کے گھر پر برات — کہوں واں کے عالم کی کیا تجھ سے بات
بلوری دھرے شمعداں بیشمار — چڑھیں بتیاں موم کی چار چار
نئے رنگ کے اور نئے طور کے — دھرے ہر طرف جھاڑ بلور کے
تماشائیوں کی یہ کثرت کہ بس — ملے ایک سے ایک سب پیش و پس
وہ دولھا کا مسند پہ جا بیٹھنا — برابر رفیقوں کا آ بیٹھنا
ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان — پلا سب کو شربت دئے پان دان
وہ سب ہو چکے جبکہ رسم و رسوم — سواری کی ہونے لگی پھر تو دھوم
سحر کا وہ ہونا وہ لٹنے کا وقت — وہ دولھن کی رخصت وہ رونے کا وقت
وہ دولھن کا رو رو کے ہونا جدا — وہ ماں باپ کا اور رونا جدا

نکلتے وہ جانا محل سے جہیز
کہ خوں چشم سے اشک ہو ہو خیز

یہاں موت ہے اہل عرفان کو
کہ جانا ہے اک دن یونہیں جان کو

وہ جو سر بلندی سے ہیں آشنا
وہ شادی کا لیتے ہیں غم سے مزا

شہزادے کا ملنا

پڑا شہر میں یک بیک پھر یہ غل
کہ غائب ہوا تھا سو آیا وہ گل

خبر یہ ہوئی جب کہ ماں باپ کو
کیا گم اُنھوں نے وہیں آپ کو

لگے رونے آپس میں زار و نزار
کہا اے ہم کو نہیں اعتبار

کہا سب نے صاحب چلو تو سہی
یہ بیٹا تمہارا وہی ہے وہی

مگر سُنا جبکہ بیٹے کا نانوں
چلا پھر تو روتا ہوا ننگے پانوں

جو ہیں اپنے کعبہ کو دیکھا رواں
چلا سر کے بل بے نظیر جہاں

گرا پانوں پر کہہ کے یہ باپ کے
خدا نے دکھائے قدم آپ کے

سُنی یہ صدا جو نہیں اُس ماہ کی
تو اُس غم رسیدہ نے اک آہ کی

ملے پھر تو آپس میں وہ خوب سے
کہ یوسف ملے جیسے یعقوب سے

ہوئے شاد و خرم صغیر و کبیر
چلے لے کے نذریں امیر و وزیر

ہمہ عیش سے سب کو مستی ہوئی
نئے سر سے آباد بستی ہوئی

در آمد ہوا گھر میں سرو رواں
لیے ساتھ اپنے وہ غنچہ دہاں

کہ اتنے میں آگے نظر جو پڑی
تو دیکھا کہ ہے راہ میں ماں کھڑی

بہے چشم سے آنسوؤں کے قطار
گرا ماں کے قدموں پہ بے اختیار

وہ ماں خوب بیٹے کے لگ کر گلے
یہ روئی کہ آنسو کے نالے چلے

بہو اور بیٹے کو چھاتی لگا
وہ دولہن کی دولہا سے لے بلا

ہوئی جان اور جی سے اُن پر نثار
پیا پانی اُن دونوں پہ وار وار

وہ آنکھیں جو اندھی تھیں روشن ہوئیں ۔۔۔ زمینیں جو تھیں خشک گلشن ہوئیں
زبس باپ ماں کو تھی سہرے کی چاہ ۔۔۔ دوبارہ انھوں نے کیا اُس کا بیاہ
بنا اِن کی تقدیر کا جو بگاڑ ۔۔۔ نکالے انھوں نے یہ سب دل کے بخار
ہوا شہر پر فضلِ پروردگار ۔۔۔ وہی شاہزادہ - وہی شہریار
وہی بلبلیں اور وہی بوستاں ۔۔۔ شگفتہ گُل و جمع دوستاں

دولت اور وقت کا مناظرہ (حسن دہلوی)

ایک دن وقت نے دولت سے کہا ۔۔۔ سچ بتا مجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے سرمایۂ عزت یا میں ۔۔۔ تو ہے انسان کی دولت یا میں
ہے زمانے میں بڑی بات تری ۔۔۔ دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری
وقت سے جس کے یہ دولت نے کہا ۔۔۔ تجھ کو اے وقت نہیں عقل ذرا
ہے عجب جس کو خدائی مانے ۔۔۔ اُس کی تو خوبیوں میں شک جانے
سبزہ ہے گلشنِ دُنیا مجھ سے ۔۔۔ لیتے ہیں توشۂ عقبیٰ مجھ سے
نام اقبال ہے آنے کا مرے ۔۔۔ لقب ادبار ہے جانے کا مرے
مجھ سے پاتے ہیں ہُنر نشو و نما ۔۔۔ علم بھی ایک طفیلی ہے مرا
لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال ۔۔۔ لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر ۔۔۔ میں نہ ہوں تو نہیں کچھ قدر بشر
چند روزہ آ گئی میں جس کے کام ۔۔۔ زندہ تا حشر رہا اُس کا نام
جب سے مجھکو نہ سرو کار رہا ۔۔۔ وہ سدا خوار و نگونسار رہا
مُنہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں ۔۔۔ اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں
چاہتے ہیں مجھے سب خورد و کلاں ۔۔۔ پھرتے ہیں تجسّس میں مری پیر و جواں
گر نہیں میں تو کوئی کام نہ ہو ۔۔۔ کسی آغاز کا انجام نہ ہو

کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا
ہیں رکھائی سے مری سب لرزاں
جس سے دنیا میں نہ ہیں راہ کرداں
الغرض ہے مری وہ شان عظیم
جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھکو
تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا
وقت نے حسن کے کیا اے دولت
ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے مگر
تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی
کیجیے فرض تجھے گر چشمہ
میں ہوں یا تو ہے اساس امکاں
تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں
ہے قبا جو ترا گر عطر آگیں
ہے عبث تجھکو تفوق کا خیال
بے مجھے مجھنے میں ہوں میں اے دولت
لاکھ یار اُن سے اگر بھاگے تو
اُن کی مٹھی میں ہے تو اے دولت
نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود
کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر
ایک پل میری اگر دیجے گنوا
تو اگر اپنی لٹا دے ثروت

درمیاں گر نہ قدم ہو پیدا
میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں
ہو اگر شیر تو روباہ کروں
کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم
میری عظمت نہیں باور تجھکو
تو نے تجھ سے تجھے گمراہ کیا
شک نہیں اس میں ذرا اے دولت
اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھکو خبر
اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی
تو ہو اس چشمہ کا میں سرچشمہ
پہلے دریا ہے کہ مچھلی ناداں
تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں
میں ہوں اس عطر کی واللہ زمیں
تو ہے گر مال تو میں راس المال
تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دست قدرت
بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو
طائر رشتہ بپا کی صورت
جس کا نایاب ہے عالم میں وجود
جا کے میں ہاتھ میں آتا نہیں پھر
جیسے ہاتھ اُس سے ہمیشہ کو اٹھا
پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت

ہیں اسی واسطے جو اہلِ تمیز — میری اک اک پل اُنکو ہے عزیز

میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس — سب مرا جاگتے سوتے اُنھیں پاس

جانتے ہیں حکماء و عرفا — مجھ کو سرمایۂ دین و دُنیا

دل میں جس کے مری کچھ قدر نہیں — اُن کی قسمت میں نہ دُنیا ہے نہ دیں

نہ کوئی کام ہو اُن سے انجام — نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام

نہ اُنھیں دین کی دولت ہاتھ لگے — اور نہ دُنیا کبھی اُن سے پتیائے

نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلواۃ — نہ ہو قدرت میں حج اُن کی نہ زکواۃ

نہ مدد اُن سے کچھ اپنی کی جائے — نہ خبر اُن سے کسی کی لی جائے

گن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت — ہے مگر تنگ مجالِ فرصت

بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو — بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

اِس میں ہے میرا سراسر نقصان — کہ ہے انمول مری ایک اک آن

(حالی)

مثنوی خواب امن

خسرو امن کا دربار

میں کہ آشوبِ جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت — امن کو سمجھا غنیمت دلِ غم دیدہ بہت

شوقِ دل لے کے غرض قصر میں آیا مجھکو — پر عجب عالمِ نیرنگ دکھایا مجھکو

خسروِ امن تھا واں جلوہ فزائے دربار — دیتی فرحت تھی دل و جان کو ہوائے دربار

اُسکے آگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا — آپ تھا پھولوں کے جھولے میں پڑا جھول رہا

نیند کا جھونکا تھا جھولے کو جھلاتا جاتا — مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا

گلِ خورشید تھا واں ہر گلِ شاداب سدا — دُھوپ کی جا تھی مگر چادرِ مہتاب سدا

صبح دن رات گھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں — نُور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں

ہاتھ باندھے تھیں مرادیں ہر جا آگے
آرزوئیں تھیں کھڑی ناچتی چھم چھم آگے

دولت و عیش و طرب تھے اُمڈے دریا
کرتے تھے نظم و نسق جملہ بر لب دریا

دل میں افکار پریشاں کا نہ ٹھکانا تھا وہاں
ہاتھ جمعیت خاطر کے تھے سب کام وہاں

مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب چھائے ہوئے
دامن امن و امان خلق پہ پھیلائے ہوئے

شغل میں اپنے ہر اک شخص تھا مشغول وہاں
چلتا تھا راحت و آرام کے پھل پھول وہاں

علم امن کا شکریہ ادا کرتا ہے

دفعتہً دیکھا کہ اک پیر کہن سال آئے
پر عجب شان سے وہ مرد خوش اقبال آئے

جسم پر گو ہیں پہنے ہوئے جامہ کالا
تن پہ جبّہ عربی سر پہ عمامہ کالا

پاؤں تک شملۂ دستار جو آجاتا تھا
اُن کی مقدار فضیلت کی بتا جاتا تھا

لاغری چہرے پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت
رُخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ بھاری ریش مقدس میں کیا پیری نے
اور جھکایا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کچھ لوگ کتابیں تھے اُٹھائے آتے
اور بغل میں کئی جزدان دبائے آتے

سب کے سب پیچھے بصد صدق و صفا آتے تھے
ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے

الغرض بادشہ امن کے آگے آ کے
پہلے سب نے یہ ادب دست دعا پھیلا کے

پھر یہ کی عرض کہ آئے ہیں وکالت کے لئے
علم نے بھیجا ہے تقدیم رسالت کے لئے

اہل تصنیف ہیں تصنیف میں مشغول سدا
ہے ہر اک شہرت تعریف میں معروف سدا

اہل تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں
اور جہاں میں انھیں فکر سحر و شام نہیں

دمبدم علم ہے کرتا عمل ایجاد نئے
آتے ہیں کار گہ دہر میں استاد نئے

درس و تدریس کے چرچے جو ہیں گھر گھر جاری
ہیں یہ جمعیت خاطر کی باتیں ساری

جو ہمیں چاہئیں موجود ہیں سارے سامان
ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے سامان

اے شہ امن یہ سب فیض و کرم تیرے ہیں
کشورِ علم میں سب پھر یہ قدم تیرے ہیں

تو نہ ہوئے تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جائے
سب کا شیرازہ اوراق پریشاں ہو جائے

زراعت شکریہ ادا کرتی ہے

تھا انھوں نے ابھی دفتر نہ سمیٹا اپنا
اور نہ کتبا تھا اپنے طومار پیشا اپنا

دیکھا انبوہ ہے اک سب سے زیادہ آتا
ہے سوار ان میں کوئی کوئی پیادہ آتا

گھوڑے یاں آگے سواری میں کچھ پیچھے
اور کئی بیل لیے آتے ہیں گھیرے پیچھے

گھوڑا نہیں ہے کوئی کو سارہ اٹھائے آتا
کوئی ہل اپنا بغل میں ہے دبائے آتا

تن کے کوڑے کندھوں پہ دھرے آتے ہیں
نئی فصلوں کے نتائج انھیں بھرے لاتے ہیں

طرح اہرانے کے جن لوگوں سے نہیں پائے ہوئے
بالیں گیہوں کی وہ پگڑی میں ہیں لٹکائے ہوئے

ہمت و عزم میں بوڑھے بھی جواں ہیں انکے
تندرستی کے نشاں منہ پہ عیاں ہیں انکے

دیکھ انھیں سب علما ہٹ کے کنارے آئے
بے تکلف سر دربار وہ سارے آئے

اور کہا سب نے کہ اے بادشہ امن و اماں
تجھ سے جاری ہے زمانے میں رہ امن و اماں

کر کے طے گھر سے بہت فرسنگ و میل آئے ہیں
جانب اہل زراعت سے وکیل آئے ہیں

کہ وہ صحرا میں جو بیٹھے ہیں سہارے تیرے
آسرے تکتے ہیں دن رات [illegible] تیرے

کھیت پہ بیٹھے ہوئے ہیں تو دعا کرتے ہیں
گھر میں ہیں تو ترے شکر ادا کرتے ہیں

تو وہ نیساں ہے کہ جس کھیت پہ آجاتا ہے
خاک پر آب زمرد کو بچھا جاتا ہے

کشت امید زمانے کی ہری ہے تجھ سے
سبز کھیتوں کی سدا گود بھری ہے تجھ سے

پیر دہقاں کہ جو ہے سائے میں تیرے بیٹھا
جان و مال اپنا ہے مٹی میں بکھیرے بیٹھا

سایۂ امن ترا اس کو ہرا رکھتا ہے
ہر بلا فتنہ سے محفوظ سدا رکھتا ہے

تو بچاتا ہے زمانے کی لگد کوبی سے
ترکتازان حوادث کی پر آشوبی سے

فیض رحمت ترا ہر لحظہ بڑھاتا ہے اسے
زور تیرا ہے کہ زر کر کے اٹھاتا ہے اسے

کرتا خرمن ہے تو ہی بکھرے ہوئے دانوں کو
تو ہی اک دانے سے ہے پالتا سو جانوں کو

تو نہ ہوتے تو ہرے کھیت ہوتے پامال تمام | دم میں ہو خلق خدا کال سے بدحال تمام

تجارت شکریہ ادا کرتی ہے

سخن ان کا نہ سرِ خاتمہ آیا تھا ابھی | اور زراعت نے یہ مضمون نہ اٹھایا تھا ابھی
لوگ کچھ اور بھی آ گئے پئے تقریر وہاں | دشت و دریا کی لگے کھینچنے تصویر وہاں
گرچہ حال اپنا زباں سے نہ بتاتے تھے وہ سب | مگر انداز سے لیکن نظر آتے تھے وہ سب
کہ ابھی قطع کیے راہِ سفر آئے ہیں | ریل سے یا کہ جہازوں سے اتر آئے ہیں
تھا کوئی دوش پہ خورجیں اٹھائے آتا | اور بغل میں کوئی بیگ اپنا دبائے آتا
رنگ سنولائے ہوئے چہرے تھے گرد آلود | دل تھے کلفت زدہ اور سینے تھے درد آلود
دشت و دریا کے عجائب تھے وہ ہمراہ لیے | تحفے ہر ملک کے ہاتھوں میں پئے شاہ لیے
خسروِ امن کے دربار میں جب آ گئے وہ | بعد آداب زباں پر یہ سخن لائے وہ
اے شہِ امن دعا خلق خدا کرتی ہے | اور تجارت ترا شکرانہ ادا کرتی ہے
کہ ترے نظم و نسق سے جو ہیں کھیپ جاری | شرق سے غرب کی جنسیں ہیں پہنچتی ساری
ہم اٹھا لیتے ہیں نفعِ درم و دام ان سے | اور جو گھر بیٹھے ہیں پاتے ہیں وہ آرام ان سے
کاروانوں کے شب و روز جو ہیں تار لگے | کوہ و صحرا میں جہاں دیکھو ہیں بازار لگے
رہے جس جا پہ مسافر کے لیے گھر ہیں یہیں | شہر کنجشک جو چاہو تو بسیرے دیں ہیں
نہیں اصلا خطرِ رہزنی دہر انھیں | ہے ترے فیض سے ہر دشت و جبل شہر انھیں
کوئی دم لیتا ہے رستے میں کوئی سوتا ہے | پر کہیں کیل کا کھٹکا بھی نہیں ہوتا ہے
اے شہِ امن اگر لطف ترا عام نہ ہو | اور ترے نظم سے عالم کا سر انجام نہ ہو
ابھی بازارِ جہاں زیر و زبر ہو جائے | خانۂ امن و اماں موت کا گھر ہو جائے

صنعت و دستکاری

تھی نہ بات ان کی ابھی ختم یہ آ پہنچی | اور تجارت پہ دکاں تھی نہ بڑھانے پائی

لوگ کچھ سامنے سے اور نمودار ہوئے
لیکن اس رنگ سے وہ داخل دربار ہوئے

جیسے تختہ ہے گل بوقلموں کا آتا
یا چمن ہے کوئی نیرنگ فسوں کا آتا

ہاتھ میں تھے گل ایجاد لگائے آتے
پھول جھڑتے تھے جو تھے ہاتھ ہلاتے آتے

دستکاروں نے کیا عجب جبیں تھا ان کو
رنگ چمکا کے کیا نقش نگیں تھا ان کو

چشم صنعت سے جو تھے کام نہایت اکثر
ضعف بینائی سے عینک تھے لگائے اکثر

تحفے لائے تھے نذر کچھ گوہر و زر ہاتھوں میں
دست صنعت کے تھے گلدستہ تھا ہاتھوں میں

عرض کی آکر سر تسلیم جھکا کے سب نے
پیشکش لیکے جو آئے تھے دکھلائے سب نے

کر چکے شاہ کا جس دم حق نذرانہ ادا
تب کیا جانب صنعت سے یہ شکرانہ ادا

اے شہ امن ہمیشہ رہے دربار کھلا
کہ اسی سایہ میں اپنا بھی ہے بازار کھلا

دستکاری کے عمل تجھ سے ہیں سارے چلتے
کام سب تیرے بدولت ہیں ہمارے چلتے

تار ہے غیب کے اخبار سنائے جاتا
ریل کا تخت سلیمانؑ ہے اڑائے جاتا

کارخانے جو پڑے چلتے ہیں دن رات یہاں
اور کلیں کرتی جو جو ہیں طلسمات یہاں

اے شہ امن یہ تیری برکت ہے ساری
تیرے زوروں کی کلوں میں حرکت ہے ساری

دولت شکریہ کرتی ہے

سلسلہ صنع و صناعت کا ابھی تھا جاری
زر تقریر یہ تھے کر رہے مینا کاری

دفعتاً چاندنی دربار پہ چھائی یکسر
ہوگئے سب در و دیوار طلائی یکسر

جیسے جھڑتے سر گلبن سے ہیں گلزار پہ پھول
چاندی سونے کے برسنے لگے دربار پہ پھول

کہ پری انجمن میں اک عروس ہوا پہ آئی
آئی لیکن عجب انداز و ادا سے آئی

حسن رفتار سے تھی سرعت سیماب اڑتی
جائے دامن تھی فقط چادر مہتاب اڑتی

حسن تھا گرچہ حقیقت میں ہوائی اسکا
سر سراپا تن نازک تھا طلائی اسکا

ٹھوکروں میں تھی زر و سیم اڑاتی چلتی
باغ نرگس دم رفتار کھلاتی چلتی

تھی نہ تھمتی روشِ گردشِ ایام اک جا ۔۔۔ یعنی دیتی نہ تھی شوخی اُسے آرام اک جا
جب کہ وہ نعمتِ نو سحری آپہونچی ۔۔۔ گئی دھوم کہ دولت کی پری آپہونچی
سامنے بادشہِ امن کے حسد آگئی ۔۔۔ حسن شکرانہ میں یہ نغمۂ دلکش گاؤ
کہ جہاں تیری بدولت سے ہر اک حال میں خوش ۔۔۔ ہے کوئی شال میں خوش اور کوئی کھال میں خوش
گھر مہاجن کا جو لاکھوں سے ہے معمور شدا ۔۔۔ خوش دو پیسے کی مزدوری میں مزدور شدا

زیر دستوں کو ترے سایہ میں خوش مستی ہے ۔۔۔ اپنا سر سیتی ہاتھوں سے زبردستی ہے
ایک کا ایک پہ چل سکتا نہیں زور ذرا ۔۔۔ ہار گیا تاب جو بل مارے سرِ مور ذرا
ہند وستوں کو ضرر کچھ نہیں نقصانوں سے ۔۔۔ ہاتھ ہیں دست درازی کے جدا شانوں سے
ہے ترے نظم و نسق سے جو نظام عالم ۔۔۔ ہے آرام سے معمور یہ جام عالم

(آزاد دہلوی)

مرقعِ شبِ ماہ

اے خامۂ خوش رقم اٹھا سر ۔۔۔ دکھلا دے تو آج اپنا جوہر
عالی ہوئے وہ طرزِ تحریر ۔۔۔ زہ بام سپہر سے کہ تیر
قرطاس فلک پہ آسماں دکھا دے ۔۔۔ سطروں کو کہکشاں نہاد سے
نقطوں کی ضیا سے نجم ہوں ماند ۔۔۔ لگ جائیں زمینِ نظم کو چاند
نقطوں میں وہ سحرِ ساحری ہو ۔۔۔ زہرہ بھی فلک پہ مشتری ہو
ہو مطلعِ نورِ حسن مطلع ۔۔۔ ہم پہلوئے ماہ ہوئے مقطع
سرخی تشعرف کی ہو ایسی ۔۔۔ کھلتی ہے شفق آسماں پہ جیسے
ہو مغربیِ سخن پہ وہ ضرب ۔۔۔ سکہ ترا شرق سے ہو تا غرب
روشن ہو سوادِ خط وہ دلخواہ ۔۔۔ کھنچ جائے مرقعِ شبِ ماہ
ان چھپ گیا رات کہ میں ساماں ۔۔۔ ڈوبا وہ افق میں ماہ تاباں

ہے شب کی جو فوج آن ٹوٹی — منہ پہ ہیں ہوائیاں سی چھوٹی
تن خوف سے کانپتا ہے تھر تھر — زردی بکھری ہوئی ہے منہ پر
بھاگا خورشید دیکھ سایا — دور شب ماہتاب آیا
سرخی ہے شفق کی آسماں پر — ظلمت کا حجاب ہے جہاں پر
تاریکی شب نے سر اٹھایا — سودا عنبر یہ غالب آیا
ہونے لگا جھٹ پٹا اندھیرا — طائر لینے لگے بسیرا
گل گل سے ہے عندلیب مضطر — رخصت ہوئی الفراق کہکر
کہتی ہے رہی جو شب کو جیتی — ہیں تم سے کہونگی رات بیتی
تاکید ہے باغباں کی یکسر — ہو دخل نہ غیر کا یہاں پر
پہرا ہے روش روش جمایا — نرگس کو ہے دیدباں بنایا
دیتا ہے اذاں کوئی مسلماں — مغرب کی نماز کے ہیں ساماں
ناقوس ہیں مندروں میں بجتے — پوجا میں پران سب ہیں تجتے
حق حق کا ہے لفظ میں فقط فرق — معبود کی یاد میں ہیں سب غرق
ہیں سبحہ میں دم خدا کا بھرتے — سمرن پہ ہیں ہر کی یاد کرتے
پر ست ہے جو رہی ہے اغماں — پر نور ہے شب کا جیب و داماں
در پہ وہ جو یوں جھلی گئی ہے — پروانے سے شمع کی لگی ہے
خاموشی پہ گل ہے یہ کھلاتی — ہے چرب زبانیاں دکھاتی
ظلمت نہیں چار سو یہ پھیلی — کھولے ہوئے زلف کو ہے لیلی
تحریر نہیں یہ کہکشاں کی — ہے مانگ یہ موتیوں میں بھاری
اک نور نظر پہ قابو — پروانہ میں شتاب کہیں ہے سو
صورت جو دکھائی اپنی شب نے — رخ گھر کی طرف کیا ہے سب نے

جنگل سے ہیں آ رہے مویشی
چلنے میں دکھا رہے ہیں جیسی

دھوڑے ہے کوئی کوئی اُچھلتا
بچ کر رہے سڑک سے کوئی چلتا

چوپاں پیچھے ہے اُن کے آتا
دشمن میں یہ غزل ہے اپنی گاتا

یارب مری آہ میں اثر دے
اس شاخ کو بھی گُل و ثمر دے

دل کی مرے بیکلی کو کر دُور
دامن گُلِ تر سے بھر دے

اے راحم و مطلق الاُساری
آزاد اِس بندِ غم سے کر دے

یہ شوق ہے عالمِ بقا کا
اُڑ جاؤں خدا جو بال و پر دے

ساقی باقی رہے ترا دَور
ساغر مے ارغواں سے بھر دے

پہونچا جو وہاں نہ پھر کے آیا
کون اہلِ قبور کو خبر دے

آفت کا ہے سامنا اجل سے
اِس خاک میں بس وہی ظفر دے

عاشق جو خدا کی یاد بھولا
کچھ عقل پہ پتھر پڑے ہیں پیارے

بہار

ہوا چاروں طرف اقصائے عالم میں بہار آئی
بہار آئی دکھائی قادرِ مطلق کی شان اس نے

بہار آئی ہے پھر اپنی نقاشی دکھاتا ہے
گیا فصلِ خزاں کا کوکبِ اقبال پستی میں

یہاں سے مٹ گیا برگِ خزاں کا بدنما سایہ
ہوائے صبح اُسکے ساتھ پنکھا جھلتی آتی ہے

پہاڑوں سے بہایا مینہ نے برف صاف پگھلا کے
نسیم باغ نے سیکھا چلن اترا کے چلنے کا

چمن کی شکل ہر گل نے لباسِ سرخ پہنا ہے
بہار آئی بہار آئی بہار آئی بہار آئی

زمیں کے تہ میں جو مرجھے تھے قالی [illegible]
بہت رنگین نقشے سامنے آنکھوں کے لاتا ہے

بہار اب حکمراں ہے ہر طرف اقلیمِ ہستی میں
بہار اب ڈھاتی ہے اختر فلک کے [illegible]

ہنسی ہنستی ہیں کلیاں جب یہ انکو منہ لگاتی ہے
رواں ہو کر رہی پانی سمندر میں ملا جاکر

زمانہ آ گیا پردے سے بستر کے نکلنے کا
شجر کے جسم پر کیا خوشنما پتوں کا گہنا ہے

ہوا مشاطگی پر نسیمِ اعظم جو آمادہ
تعجب کیا جو ہیبت سے خزاں کے رخ پہ سودا ہے
نکل آئے حجابِ ارض سے گل بیر بہٹ لاکھوں
پلاتی ہے شجر کو اوس ایسا دودھ لا لا کر
جڑیں اندر ہی اندر پھیل کر قوت پکڑتی ہیں
ہوئے ہیں رنگ برنگ جسم کے کہا تھا وہ شجر رنگیں
چمن اور دشت میں ہے ہر طرف انبار پھولوں کا
عیاں سبزہ پہ الفت کی ادائیں کی ہیں سمیع نے
ہلیں روشن چاندنی کے پھول پایا ہے کھلتے ہیں
سمجھ کر جب اگاتی ہے زمیں تب زرد کرتی ہے
ہزاروں رنگ کی چڑیاں ہیں شکلیں خوشنما جنکی
بہار آنے سے خوش ہیں ہر طرف اتراتی پھرتی ہیں
دیا ہے تتلیوں کو رزق کا سامان پھولوں نے
ہوا ہی نے کھلائے گل ہوا ہی پھر گراتی ہے
غرض اے شوق اترانا عبث ہے حسنِ فانی پہ

سنوارا مختلف رنگوں سے دنیا کا رخِ سادہ
کہ وہ فوج آمس پہ غالب آ گئی جسکی سپر وردی ہے
کہیں ہیں سرو قد لاکھوں کہیں غنچہ دہن لاکھوں
محبت سے ہوا منہ چومتی ہے بار بار آ کر
زمیں انکو جکڑتی ہے زمیں کو وہ جکڑتی ہیں
کہ ہے ہر شاخ رنگیں برگ رنگیں اور ثمر رنگیں
جدھر دیکھو زمیں پہنے ہوئے ہے ہار پھولوں کا
بڑھا کر ہاتھ کرنوں کے بلائیں لی ہیں سورج نے
کھلے ہیں پھول لالہ کے کہ انگارے دہکتے ہیں
ہوا کرتوں سے ملکر زرد رنگت اسمیں بھرتی ہے
ادائیں دلربا جنکی صدائیں نغمہ زا جنکی
ہوا تو ناچتی پھرتی ہے چڑیاں گاتی پھرتی ہیں
کیا بھوروں کو جوشِ فیض سے مہماں پھولوں نے
زمیں جس نے کیا پیدا وہی پھر انکو کھاتی ہے
گھمنڈ انسان کو نازیبا ہے دو دن کی جوانی پر

(احمد علی شوق قدوائی)

بزمِ عشرتِ دنیا

دلِ پر جوش ضبطِ راز کب تک
خیالِ شوخیِ غماز کب تک

ہوا تو مونس و ہمراز جاں ہے
خیال اس وقت کہ تیرا کہاں ہے

گلستاں میں ہے جوشِ خندۂ گل
رہے خاموش کیوں منقار بلبل

غضب جوبن پہ ہے پھولوں کی لالی
غنیمت ہیں یہ ایام دیا لی

اب خاموش کو شکر فشاں کر
خیالِ خاص کی باتیں بیاں کر

کہا علی نے کہ اے ہم بزمِ عشرت
میں ہوں کل شب سے مستِ جامِ حیرت

میں اک بزمِ طرب میں میہماں تھا
بدل ممنونِ لطفِ میزباں تھا

سراپردہ میں جب داخل ہوا میں
وہ کچھ دیکھا کہ حیراں رہ گیا میں

ہجومِ میہماناں دمبدم تھا
صلائے عامِ الطاف و کرم تھا

کوئی مستِ شکوہِ خسروانہ
رہینِ ناز و ادب انداز شہانہ

کوئی صوفی صفت سرگرمِ توحید
کوئی آزادہ وش شیدائے تجرید

کوئی مستِ خیالِ ساغر و مے
کوئی محوِ تلاشِ بربط و نے

کوئی اپنی خود آرائی پہ شیدا
فدائے ناز و رعنائی پہ شیدا

کوئی شمشیر در کف طالبِ جنگ
غرض جس شخص کو دیکھا جدا رنگ

صفیں موزوں کیے بیٹھے ہیں خوش خو
صنوبر قامتانِ عنبریں مو

کہیں دہقاں کسی جانب کوہسار
زباں وحشی میں سرگرمِ گفتار

مہیا جابجا کھانے کے ساماں
جہاں جس صنف کو دیکھا فراواں

پیاپے تازہ کھانا پک رہا ہے
کمر باندھے ہر اک خادم کھڑا ہے

ہر اک سے عرض بیگی کہہ رہا ہے
تمہارے واسطے ساماں ہوا ہے

صلائے عام ہے سب آؤ کھاؤ
جو کچھ مرغوب ہو منگواؤ کھاؤ

جو ہیں اہلِ جماعت حصے لیجائیں
برابر ساتھیوں میں بیٹھ کر کھائیں

ولیکن منصفانہ ہو وہ قسمت
کہ تا ہر فرد ہو سرگرمِ فرحت

جسے درکار ہو مانگے یہاں سے
نہ چھینے کوئی عاجز میہماں سے

کمی یاں کچھ کسی شے کی نہیں ہے
یہ بزمِ دعوتِ شاہِ زمیں ہے

ضعیفوں کی قوی خدمت بجا لائیں
انھیں بٹھلا کے اپنے ساتھ کھلوائیں

کریں نگرانی اہل قوت و زور
اُٹھا ہووے نہ پیشہ ظلمت و زور

ہمیں بولیں پھر یہ دیکھیں پیش کیا ہیں
سپاس میزباں دل سے بجا لائیں

پیام شاہ جب پہنچا چکا وہ
مخاطب ہو کے پھر کہنے لگا وہ

سنو اے میہمانو تم مری بات
کہ بزم امتحاں ہے آج کی رات

شہنشاہ دو عالم میزباں ہے
خوشا بخت اُسکا جو یاں میہماں ہے

سحر قصر شہنشاہی کھلے گا
سجے ہیں جس میں کمرے لاکھوں زیبا

دکھائے آج جو جیسی لیاقت
اُسی درجے کی کل وہ پائے نعمت

زباں پہ میرے ہے جس قصر کی بات
اُسی کا نام ہے دار المکافات

سمجھ اور سوچ کر اب تم یہ کھاؤ
ملا ہے حکم تم کو جو بجا لاؤ

وہ دیکھو غرفۂ ایواں کھلا ہے
تمہارا میزباں خود دیکھتا ہے

ذرا بھی کچھ چھپا سکتے نہیں تم
نظر اُس کی بچا سکتے نہیں تم

کوئی جو کچھ فسوں سازی کریگا
دل اُس کا اُسکی غمازی کریگا

ہر اک کو حرص بیجا نے ستایا
مگر ہر ایک نرالا رنگ لایا

کوئی تو پیٹ بھرنے میں ہوا محو
کوئی کھانے بچانے میں ہوا محو

کسی نے دست جبر اپنا بڑھا کے
گلا گھونٹا کسی عاجز کا جا کے

کریم النفس تھے ایسے بھی اکثر
کہ کمریں باندھ کر مانند چاکر

ضعیفوں کی لگے کرنے مدارات
بدل تعمیل کی جو کچھ سنی ملت

کچھ ایسے بھی وہاں آزاد دیکھے
جو یکسوئی کی دھن میں شاد دیکھے

وہیں ایسے بھی دیکھے عالی ہمت
کہ اپنے حصے کے خوان کی نعمت

لگے تقسیم کرنے خود نہ کھا کر
کریموں کی طرح سب سے چھپا کر

نظر ایسے بھی آئے پاک طینت
نہ تھی اُنکو کسی شے سے بھی رغبت

سوے ایوان شاہی لو لگائے
کھڑے ہیں دم بخود آنکھیں ملائے

بندھی ہے ٹکٹکی تن کا نہیں ہوش
بھرا ہے دل میں شوقِ دید کا جوش

خردمند ایسے بھی واں بیٹھے پائے
سوے ایوانِ شہ ہیں لو لگائے

غریبوں کی بھی خدمت کر رہے ہیں
عتابِ شہ سے دل میں ڈر رہے ہیں

کھلاتے بھی ہیں اور خود بھی ہیں کھاتے
خوشی پہنچا کے ہیں خوشیاں مناتے

بہت ایسے بھی دیکھے میں نے بیباک
سمجھتے تھے جو خود کو فن میں چالاک

ٹگے جیبیں کترتے دھوکے دیکر
جو کچھ پایا چلے مٹھی میں لیکر

کمیں تھے پُر غضب بدکار خونخوار
جفا پیشہ ستمگر مردم آزار

غرض ہر اک تھا حالِ خاص میں محو
بطرزِ خود خیالِ خاص میں محو

بغور اُن کے جو دیکھے میں نے احوال
نظر آیا مجھے پھر اک نیا حال

کمر میں سب کے اک پھندا پڑا ہے
بہت باریک ڈورے سے بندھا ہے

اور اُس ڈورے میں گرہیں پڑی ہوئی ہیں
وہ سب نوبت بنوبت کھل رہی ہیں

مگر ہے مختلف گرہوں کی تعداد
نہیں مقدار ان سب کی مجھے یاد

کسی میں دس کسی میں بیس یا تیس
کم از کم ایک زیادہ ایک سو بیس

گرہ کے آگے اور پیچھے برابر
بنے ہیں کچھ نشاں ڈورے کے اوپر

سرا ڈورے کا ہے پردے کے باہر
کوئی تھامے ہوئے ہوگا مقرر

کشش ڈورے کی ہے باہر کو پیہم
نہیں تھمتا کسی ساعت کسی دم

نشانِ خاص تک جس وقت پہونچا
لگاتا ہے کوئی باہر سے جھٹکا

پتا ملتا نہیں پھر رفتنی کا
گذرتی ہے نہ معلوم اُس پہ پھر کیا

تماشا میں نے یہ دیکھا پیاپے
بجاتا تھا ابھی اک خوش ادا نے

لگا جھٹکا کہاں پھر نے کہاں وہ
نہ آیا تھا کبھی گویا یہاں وہ

ابھی اک شوخ محوِ زلف و شانہ
حسین دہر کہلائے زمانہ

خرام ناز میں نخوت سے تن کر
نظر کرتا تھا وہ سرو چمن پر

یکایک کھائے جھٹکا لڑکھڑایا
کھنچا پردے سے باہر پھر نہ آیا

کوئی ہوتے ہی داخل جھٹکا کھاکر
پھرا الٹے قدم صورت دکھاکر

لگا تانتا یہ آمد شد کا ایسا
کہ اب تک ہے عجب بالکل اچنبھا

کھنچے اکثر شروع شب میں پہلے
پھر کی جب بھی نوبت تو پھر واں

ہوئی وہ گرمیِ محفل کہ مت پوچھ
بیاں لطف ہے مشکل کو مت پوچھ

نیاز و ناز کا اقبال چمکا
امنگوں کا بہا پر جوش دریا

کھنچے مہمان بھی محفل سے کم کم
ہوا کچھ اور ہی مجلس کا عالم

گیا آدھی ڈھلے پھیکا پڑا رنگ
لگے سب اونگھنے ہونے لگے تنگ

لگے ڈوروں میں بھی کھنچنے پیاپے
کوئی خوش اور کوئی ناشاد کھنچے

بوقتِ صبح کی جیسے نظر واں
وہ محفل گاہ تھی اک ہو کا میدان

تاسف سے ہوا میں دل میں شدشد
کہا خادم نے شہ کے مت ہو مضطر

ہزاروں محفلیں ہیں لاکھوں جہاں
ابھی تک تو نے کیا دیکھا ہے ناداں

شہنشاہانہ فیاضی ہے دائم
ازل سے ہے ابد تک یوں ہی قائم

بجالا حکم شاہی شاد وہاں رہ
ہر اک محفل کا رنگیں میہماں رہ

مطیعوں پر کھلے ہیں باب رحمت
مؤدب پاتے ہیں ہر روز خلعت

حضوری ملتی ہے اہل طلب کو
خطاب قرب ارباب ادب کو

خیالِ غیر سے مطلب نہ رکھنا
توقع غیر ارباب رب نہ رکھنا

برا ہوتا ہے بدکاروں کا انجام
برے اعمال سے رکھیو نہ تو کام

کیا کر بیکسوں کی دستگیری
یہی ہے شاہ کی فرماں پذیری

کسی کا حق نہ چھو یہ ہے دیانت
طلب کر آستانِ شہ سے حشمت

اسی بابِ کرم پر رہ جبیں سا
یہیں سے پائی ہے سب نے تمنا

یہ کہکر خادمِ شاہی بعجلت
ہوا مجھ سے ملا کر ہاتھ رخصت

تعجب ہے مجھے یہ راز کیا تھا
ہوئی کس طرح یہ ہم بزم ریبا

کہا میں نے دلا افسوس مت کر
ہمیں کافی ہے بابِ ربِّ اکبر

ملازم ایزدی دربار کے ہیں
سہارے پہ بڑی سرکار کے ہیں

خیالِ احمدی کیوں ہو پریشاں
حضورِ آستانِ پاک یزداں

(نواب غلام احمد یار خاں احمدی)

ایک پرندہ اور جگنو

سرِ شام ایک مرغِ نغمہ سرا
کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا

چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر
اڑا طائر اسے جگنو سمجھکر

کہا جگنو نے او مرغِ نوا ریز
نہ کر بیکس پہ منقارِ ہوس تیز

تجھے جس نے چہک گل کو مہک دی
اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی

لباسِ نور میں مستور ہوں میں
پتنگوں کا جہاں کے طور ہوں میں

چہک تیری بہشتِ گوش اگر ہے
چمک میری بھی فردوسِ نظر ہے

پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی
تجھے اس نے صدائے دلربا دی

تری منقار کو گانا سکھایا
مجھے گلزار کی مشعل بنایا

چمک بخشی مجھے آواز تجھ کو
دیا ہے سوز مجھ کو ساز تجھ کو

مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز
جہاں میں ساز کا ہے ہمنشیں سوز

قیامِ بزمِ ہستی ہے انھیں سے
ظہورِ اوج و پستی ہے انھیں سے

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

دو ستارے

آئے جو قران میں دو ستارے
کہنے لگا ایک دوسرے سے
یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب
انجام خرام ہو تو کیا خوب
تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو
ہم دونوں کی ایک ہی چمک ہو
لیکن یہ وصال کی تمنّا
پیغام فراق تھی سراپا
گردش تاروں کا ہے مقدّر
ہر ایک کی راہ ہے مقرّر
ہے خواب ثباتِ آشنائی
آئینِ جہاں کا ہے جدائی

(اقبال ایم۔اے)

اولاد

دولت کوئی دُنیا میں پسر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
لذّت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
نکہت کوئی بوئے گلِ تر سے نہیں بہتر

صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی روح یہی روح یہی ہے

ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اسی سے
وہ گل ہے کہ گھر رشکِ گلستاں ہے اسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہے اسی سے
آبادی کاشانۂ انساں ہے اسی سے

کس طرح کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ وہ ہے عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے
یہ وہ ہے نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پُر نور مکاں رہتا ہے جس سے
وہ دُر ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے

کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

صولت یہی شوکت یہی اجلال یہی ہے
ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہے

سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے — گوہر یہی یاقوت یہی لال یہی ہے
دلبند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسایش و راحت ہے پسر سے — تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
خوں جسم میں ہے آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے — ایام ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے
آرام جگر قوت دل راحت جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

وہ شے ہے خوشی دم پہ کھڑی رہتی ہے جس سے — وہ چین ہے راحت کی گھڑی رہتی ہے جس سے
وہ نخل ہے امید بندھی رہتی ہے جس سے — وہ دُر ہے یہ دو جان لڑی رہتی ہے جس سے
آرام جگر تاب و تواں ساتھ ہے اس کے
پھرتا ہے جدھر راحت جاں ساتھ ہے اس کے

مالک سے بھرے گھر کے اجڑ جانے کو پوچھو — گھر والوں سے اس تفرقہ پڑ جانے کو پوچھو
ماں باپ سے قسمت کے بگڑ جانے کو پوچھو — یعقوب سے یوسف کے بچھڑ جانے کو پوچھو
اللہ دکھائے نہ الم نور نظر کا
بہ جاتا ہے آنکھوں سے لہو تاب جگر کا

(میر انیس)

غریب الوطنی

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں — راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
سو شغل ہوں پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں — پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں
سنگ غم فرقت دل نازک پہ گراں ہے
اندوہ غریب الوطنی کاہش جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو قافلہ و زاد — جاتی نہیں افسردگی خاطر ناشاد

جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد — ہر گام پہ دل مثلِ جرس کرتا ہے فریاد

اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ہوتی

منزل پہ کبھی آرام کی صورت نہیں ہوتی

ہمراہ سفر میں ہو اگر حامی و ناصر — منزل پہ کمر کھول کے سوتے ہیں مسافر

جب ہو سفر و خوفِ پریشانیٔ خاطر — شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہے آخر

ہر طرح مسافر کے لئے رنج و تعب ہے

رہ جائے پسِ قافلہ تھک کر تو غضب ہے

دُکھ دیتے ہیں اک ایک قدم پاؤں کے چھالے — منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے

ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے — ڈر ہے کہ نہ رہ جائیں کہیں قافلے والے

درماندہ کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی

تھک کر بھی جو بیٹھے تو اٹھاتا نہیں کوئی

(میر انیس)

نصائح

جھک کے ادنیٰ سے ملا چاہیے اعلیٰ کے لیے — کبر زیبا ہے فقط خالقِ یکتا کے لیے

تیغ کو دیکھیے یہ سر ہو اسے بیجا کے لیے — کہ فنا ایک نہ اک روز ہے دنیا کے لیے

قلب میں نور رہے بدر کے پرتو کی طرح

اوج بھی پائے تو جھک جائے مہِ نو کی طرح

ہی جھکنے سے سرو پیدا ہوا کامل — ثمر کو ہوتی ہے پستی سے بلندی حاصل

سرکشی کرنے سے ہوتا ہے بشر نا قابل — قول معروف ہے گر دیکھ لے دو سیر کا دل

ہے وہ بات کہ انسان بھلا بھی نہ سکے

کوئی اچھا نہ کہے گر تو برا بھی نہ کہے

جو ہیں بینا وہ انگشت رکھیں دنیا پہ — بات سب جاتی ہے ملنے میں سخن ہیں تو ل

ہر شے کے تم تھے جویا ہر چیز کے تھے شائق آخر ہوئے جہاں میں اہل جہاں پہ فائق

ہر علم و فن میں اپنا علم ادب نہ چھوٹے
تم سے پھلے گلستاں گلزار تم سے پھولے

تھا جو ادب تمہارا معشوق بھا وہ بالکل تم بیٹھتے تو ہوتا اظہار صد تجمل
اٹھتے جو تم تو اٹھتا تعظیم کو تجمل چلتے تو ساتھ چلتے آداب دہر بالکل

اب وہ صفات تم سے رخصت ہوئے ہیں بھائی
جو کرتے ہو غلط ہے دھن ہے غلط سمائی

ہو سنسکرت بھاشا یا فارسی و تازی ہو صورت صفاہاں یا ہیکل حجازی
ہو جلوہ حقیقی یا عشوۂ مجازی ہے رنگ سب میں یکساں یکساں ہے رنگ ساری

جو بات جس زباں میں دیکھو گے تم ادب کی
ہے قفل ایک اُن کا کنجی الگ ہے سب کی

ہندوستاں میں رہتے یا ساکن عرب تھے مسکن کہیں ہو لیکن مجموعۂ ادب تھے
نسخے شفا کے ہنستے ملتے کہیں جو لب تھے اس مدرسے میں جو تھے حکمت مآب سب تھے

پچھلے ادب میں اپنے آداب شاہ دیکھو
چلتی ہے کس ادب سے یہ شاہراہ دیکھو

مشرق ادب میں اک فلسفہ ہے پنہاں دیکھو سمجھ کے شغلے دیکھو مربیہ کے قرباں
حکام کے عوارض دیکھو بنام سلطاں جنگل نہ سمجھو اس کو سمجھو ہے اک گلستاں

اس سے ادب نکالو ما قد آ کے نباؤ
جو بڑھ گیا گھٹا دو جو گھٹ گیا بڑھاؤ

سمجھو جو انشا میں ہر قوم کا ادب ہے جو جا بجا کمی ہے اپنی افسوس جاں بلب ہے
آپس کی دوستی کا جو اک بڑا سبب ہے جو اولڈ فیشنی سے مطعون رفتہ شب ہے

بگڑے ہمارے تھے جو کام اُس نے ہیں بنائے

بے شبہ اس ادب نے اپنے کئے پرائے

مفتوح اور فاتح رکھتے ہیں کچھ تفاوت — ہرگز نہ ایک ہونگے محکوم و اہل طاقت

ہر ملک کے خصائص رکھتے ہیں خاص عادت — یکساں کرے نہ سب کو دنیا میں زور فطرت

سیاح کو جہاں کے کرنا ہے سیر ممکن

دریا کے دو کنارے ہوں ایک غیر ممکن

نوکر ہیں ہم نہیں ہیں انگلش کی طرح آقا — وہ بادشہ ہمارے ہم اُن کی ہیں رعایا

ہم جج ہوں یا کلکٹر حاکم نہیں ہیں اصلا — اُن کی زبان ہے آئین قانون اُن کا منشا

ہم اُن سے مانگ سکتے سب کچھ ہیں اے برادر

لیکن نہیں ہے ممکن جو ہو سکیں برابر

انگلش نے قبضہ پایا اس ملک پر ادب سے — دیکھو بغور پڑھ کر انگلش کے عہد نامے

لکھے ہیں افسروں نے راجوں کو جو خریطے — از روئے عقل سمجھو اُن کے اثر ہیں کیسے

تاثیر سے ادب کی جو کچھ انھوں نے پایا

وہ دوسری طرح پر ہرگز نہ ہاتھ آیا

راجوں سے پہلے انگلش کرتے تھے بات جھک کر — آقا کا جیسے اپنے کرتے ادب ہیں نوکر

اُردو و فارسی میں کھولا ادب کا دفتر — آخر ادب نے چھوڑا اُن کو بنا کے قیصر

اُڑنے لگا پھریرا جب ملک میں علم کا

تب سر کیا قلم ہے تلوار سے قلم کا

گر چاہتے ہو دل میں غیروں کے گھر بنانا — گر چاہتے ہو اپنا اجڑا محل بسانا

منظور ہے جو تم کو قسمت کا آزمانا — گر چاہتے ہو تم سے ظاہر ہو فعل دانا

تو کر لو یاد اپنے بھولے ہوئے ادب کو

سپھر بات جب سکوگے باتوں سے اپنی سب کو

ہر بات میں ادب کو سمجھو تم اپنا رہبر　　ہر بات میں ادب کو سمجھو ہے خضر بیکس

یہ تاج ہے تمہارا سر تاج شاہ قیصر　　یہ ہے تمہارا بھائی یہ ہے تمہارا نوکر

ہوتے ادب سے دیکھو دنیا میں دست دشمن

روشن وہ گھر ہے جس میں شمع ادب ہو روشن

(۱ شہری)

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

دوپہر ہے اٹھو ہندوستان والو　　کچھ دن ہے کچھ تو کر لو ہندوستان والو

دن ڈھل رہا ہے دیکھو ہندوستان والو　　بس اب تو جاگو ہندوستان والو

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

جب دن ہی ڈھل گیا پھر جاگے تو فائدہ کیا　　جب شام ہو گئی پھر جاگے تو فائدہ کیا

جب ہو گیا اندھیرا اٹھے تو فائدہ کیا　　جب منزلوں ہیں پیچھے دوڑے تو فائدہ کیا

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

اٹھو کہ اب تو سب کی جانوں پر آ بنی ہے　　کچھ تو علاج کر لو یہ وقت جانکنی ہے

جینے کی اور کچھ دن دل میں اگر ٹھنی ہے　　وہ کام کر لو آخر جو کام کرنی ہے

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

بوچھار ہر طرف سے تم پر ہے مفلسی کی　　مفلس کی ہر طرح سے دنیا میں ہے خرابی

مفلس کی ہے جہاں میں بے لطف زندگانی　　مشکل ہے بے زری میں ہو موت یا کہ شادی

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

حال زبوں یہ اپنے اصلا نظر نہیں ہے　　آہیں ہیں نارسا ہیں فریاد بے اثر ہے

کل کیا تھے آج کیا ہو تم کو نہیں خبر ہے　　بے علم ہو اگر تم اولاد بے ہنر ہے

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

کھویا جو علم تم نے چھوڑا ہر اک ہنر بھی | اس طرح چھوڑ بیٹھے جس کی نہ لی خبر بھی
برباد ہو گئے تم ویران تمہارے گھر بھی | رفتار پر تمہاری ہنستے ہیں رہگذر بھی

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

عقل و خرد تمہاری استاد تھی جہاں میں | فکر و ہنر تمہاری سالار کارواں تھی
پھیکا تھا رنگ سب کا شوخی تھی وہ زباں کی | یاں کی زمین تم سے ہمدوش تھی آسماں کی

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

جو بے وقار کل تھے ہیں آج شان والے | بڑھ چڑھ کے ہو گئے ہیں نام و نشان والے
مال و منال والے ملک و مکان والے | کیا کر رہے ہیں دیکھو سارے جہان والے

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

یورپ میں جاکے دیکھو تہذیب انجمن کی | ہر اک مکان گویا تصویر ہے چمن کی
تعلیم پا رہا ہے ہر ایک علم و فن کی | الفت ہے تم کو باقی کچھ بھی اگر وطن کی

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

عالم ہے شاد اور تم غمگین ہو رہے ہو | دنیا تو ہنس رہی ہے تم ہو کہ رو رہے ہو
سب ڈھونڈتے ہیں دولت تم عمر کھو رہے ہو | ہر ایک جاگتا ہے بس تم ہی سو رہے ہو

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

دنیا کو چھان ڈالو دنیا کو دیکھ ڈالو | دنیا ہے گر کمانا دنیا ہی سے کما لو
بگڑی ہوئی سنبھالو ٹوٹی ہوئی بنا لو | اجڑے ہوئے گھروں کی پھر تازہ نیو ڈالو

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

محنت اگر کرو گے پاؤ گے تم ہی راحت | صنعت جو سیکھ لو گے پاؤ گے تم ہی دولت
آرام دیگی بعد تھوڑی سی کچھ مشقت | پھر تم ہو اور دنیا اور محفل مسرت

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو

(عشرت)

بلبل اسیر

چھائی قفس میں ہوائے باغ سے کیوں ہے رشکِ باغ
جوشِ بہار تھا کہ ہم آ گئے اسیر ہو

مجھ کو نہ دے ہم صفیر مژدۂ فصلِ بہار
آہ کہ صیاد کے دل پہ نہیں اختیار

یاد ہیں وہ دن کہ جب باغ میں تھا آشیاں
آہ وہ طرفِ چمن اور وہ سیرِ شاخسار

لالۂ احمر کا رنگ اور وہ سبزے کا روپ
گوہرِ شبنم کی آب شاہدِ گل کا شکار

رنگِ شفق کی نمود نورِ سحر کا ظہور
چرخ کی نیرنگیاں شام و سحر آشکار

مینہ برسنے کا جھوم اور وہ مینہ کا زور
رعد کا وہ زور و شور اور وہ چمک بار بار

غنچۂ نشگفتہ کی چار طرف وہ مہک
جیسے کوئی کھول دے نافۂ مشکِ تتار

گلِ نیشاستار یوسفِ مصرِ چمن
سروِ لبِ جوئبار مثلِ خضر آبدار

باغ کی سرسبزیاں نخل کی سیرابیاں
پھول کی شادابیاں ابرِ بہار آبیار

موج ہوا سے درخت ہلتے ہیں اور باغ میں
جیسے کہ دو سبزپوش الفت سے ہوں ہمکنار

دیدۂ نرگس ہے یوں شاہدِ گل کی طرف
جیسے کوئی منتظر محوِ تماشائے یار

باغ میں گلچیں کو دخل اور نہ صیاد کو
رحمتِ پروردگار چار طرف تھی بہار

ہم سے نہ تھا باغباں برسرِ کین و فساد
اپنی طرف سے نہ تھا دل میں کچھ اس کے غبار

وہ زرِ گل کی دمک جس پہ ہو کندن فدا
قطرۂ شبنم کی آب جس پہ ہو گوہر نثار

طبع کی صنعتگری پہ نہ ہوا فوق کچھ
سونے کا زیور بہت لائے بنا کر سنار

لالۂ احمر تھا وہ یا کہ عقیقِ یمن
موتیا کی تھی کلی یا کہ دُرِ شاہوار

دیکھ کے یہ رنگ ڈھنگ کہنے لگے جوہری
گل ہے ہر اک زرنگار باغ تھا ہر سو نگار

نور کا تڑکا ہوا اور یہ عالم ہوا
آئی نسیمِ سحر باغ میں مستانہ وار

آئی نسیمِ سحر باغ کو جنبش ہوئی
ہلنے لگے سب درخت گرنے لگے برگ و بار

یوں دہن غنچہ سے قطرۂ شبنم گرے   دودھ اُبلنے لگے جیسے کوئی شیر خوار

آئی کسی شاخ سے ایسی سُریلی صدا   جیسے بجائے کہیں بین کوئی بین کار

بھیڑ دیں اُڑنے لگیں باغ میں چاروں طرف   تانیں اُڑانے لگے دو بچھڑوں میں ہزار

جنبشِ بادِ سحر پھونک دے سارا چمن   ہر طرف اُٹھنے لگے آتشِ گل سے شرار

جمع کیے صبح نے ایک ہی جا نار و نور   پرتوِ خور محض نور آتشِ گل شعلہ بار

چشمۂ خورشید سے نور برسنے لگا   آتشِ گل سے اِدھر جیسے اُٹھا اک بخار

سرد ہوا میں ہوئے جبکہ بخارات جمع   پھر تو دُھواں دھار مینہ برسنے لگا ایک بار

وہ چمن اور آبِ جو اور وہ ابرِ سیاہ   رُوم و حلب پر محیط ہے سپہ زنگبار

مینہ کے برس جانے سے دھوئے گئے سب درخت   نام کو بھی باغ میں اب نہیں گرد و غبار

شاخ پر اس طرح سے شاہدِ گل جلوہ گر   جیسے زمرد کے تخت پر ہو کوئی شہریار

ایک طرف نسترن ایک طرف یاسمن   ایک طرف ارغواں سلسلے ہیں خدمتگار

اور بھی خادم کئی سامنے موجود ہیں   جن کو اشارہ کیے چلتے ہیں سب کاروبار

ہے کوئی زرّیں کمر اور کوئی زرّیں کلاہ   ہے کوئی سیمیں بدن اور کوئی سیمیں عذار

لالۂ و گل کی نمود کب ہے لبِ آبِ جو   آئینے میں دیکھتا ہے چمن اپنی بہار

شاخ سے اکثر گرے پھول جھکتے ہوئے   نہر کا پانی تمام ہو گیا عطرِ بہار

بحرِ ظلمات میں سبز پری غوطہ زن   عکس ہے شمشاد کا نہر میں یوں آشکار

چار گھڑی دن رہے کا وہ سہانا سماں   شاہد اود وہ شگفتہ صبحِ بنارس نثار

سمنج ہوا سر بسر رنگِ شفق سُرخ و زرد   لالۂ و گل کا بناؤ سرو و سمن کا سنگار

عارضِ گلگوں سے عکسِ رنگِ گلِ سُرخ کا   نشترِ مژگاں سے تیز باغ کا ہر اک نیا خار

دھوپ کی زردی کا رنگ گنبدِ نیلی کا رنگ   دونوں ملے اس طرح سبزہ ہوا آشکار

سایہ درختوں کا یوں صفحۂ گلزار پہ   جس سے کہ عکسِ شبیہ باغ کی ہو شرمسار

عکس فگن ہو کے شاخ نے یا نظر کو فریب
دیدۂ نرگس میں ہے سرمۂ دنبالہ دار

کرے جس یوں شاخ سے پھول علی الاتصال
تار نظر سے نگاہ گوندھے پھولوں کا ہار

دیکھ کے گلزار کو کہنے لگا باغباں
پھولوں کا گہنا پہن کر نکل آئی بہار

برگ ہر اک سبز سبز پھول ہر اک سرخ سرخ
مرغ چمن شاخ شاخ چہچہہ زن بار بار

مرغ چمن بلبل کے سب نغمہ سرا جس طرح
کوک دے ارگن کوئی اور الاپے بہار

سامنے ہیں مہر و ماہ دیکھیے صنع الٰہ
جیسے دو آئینہ رو ہوئیں کسی جا دوچار

ایک کو سکتہ سا ہے ایک کو حیرت سی ہے
دیکھ کے ایک ایک کو دونوں ہیں آئینہ وار

ایک کا منہ زرد ہے ایک ہے بے نور سا
دیکھ کے گردش میں ہے جیسے کوئی بیقرار

صبح کا عالم کچھ اور شام کا عالم کچھ اور
صبح ہے کافور بیز اور ہے شب مشکبار

صبح سنہری ورق شام روپہلی ورق
فیض سے وہ آفتاب شام و سحر آشکار

رات کی وہ چاندنی اور وہ گل چاندنی
جس سے شفق ماہ کی ہوتی ہے دونی بہار

دیکھ کے گل چاندنی ہوتا ہے سب کو یقیں
چادر مہتاب سے کرتے ہیں گل بے شمار

کرمک شب تاب کا ہے یہ چمن میں ہجوم
تاروں بھری رات بھی جس سے کہ ہو شرمسار

ہے گل مشکبو کی شاخ شمع شب افروز باغ
اور یہ اس شمع کے گرد ہیں پروانہ وار

باغ میں دیکھو جہاں ان کی چمک ہے عیاں
آتش گل سے مگر اڑتے ہیں پیہم شرار

ہے وسط گل میں یہ ان کے سبب سے ظہور
دائرے میں جیسے ہو حرکت اور آشکار

بسکہ ہر اک برگ پہ آگ سی ہے اک لگی
ہوتا ہے ہر نخل پہ سب کو گمان چنار

سارے چمن میں یہی سرو و سمن میں بھی
دیدۂ نرگس میں نور آتش گل میں شرار

رات کی خاموشیاں رات کی تاریکیاں
رات کی وہ راحتیں صبح کا وہ انتظار

باغ کی آرائشیں باغ کی زیبائشیں
صبح ہوا تازہ کار رنگ شفق تازہ دار

نکہت گل عطر بیز آتش گل دود خیز
نکہت گل عطر بار - آتش گل شعلہ بار

بوئے گل عنبر سرشت بسایۂ گل مشک بیز — سنبل پیچاں کے پیچ نافۂ مشک تتار
طبع چمن عطر ساز موج ہوا کار ساز — غالیہ و مشک و عود مجمرۂ عود بخار
دیکھئے جس نخل کو باغ میں ہے بامراد — طفل شگوفہ کو سب کہتے ہیں ہے بختیار
باغ کی کیفیتیں دیکھ کے ہیں وجد میں — چرخ و مہ و آفتاب انجم و لیل و نہار
فرش سے تا عرش جو شے ہے وہ حیران ہے — قابل نظارہ ہے قدرت پروردگار
تجھ سے کہاں تک کہوں قصۂ درد و درانہ — ہم اسی حیرت میں تھے اتنے میں اک دام دار
لے کے کوئی دام سخت آگیا گلزار میں — ہم جو ہیں اڑنے لگے ہو گئے اس کے شکار
آہ وہ آزادیاں راس نہ آئیں ہمیں — عہد مسرت مگر ہم سے نہ تھا استوار
اس کو ہوئیں مدتیں ہم ہیں اسیر قفس — اب ہیں نہ وہ چہچہے اور نہ باغ و بہار
سامنے ہے یہ قفس اور یہی تیلیاں — ہے یہی آب و ہوا اور یہی لیل و نہار
قید میں گذری ہے عمر چھوٹنے سے یاس ہے — مرگ کی ہے آرزو موت کا ہے انتظار
آہ کہ طبع چمن ہم سے موافق نہ تھی — آہ فراج بہار ہم سے نہ تھا سازگار

حالت بلبل اسیر تجھ سے کہوں کیا جگر
دیدۂ عبرت سے ہوں اشک رواں بار بار

(از مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی)

قصیدہ گویا

برنگ گل جسے اب دیکھیے وہ خنداں ہے — بہار عیش سے ہندوستاں گلستاں ہے
بنایا ہند کو گلشن بہار نے ایسا — کہ شوق سیر میں سرو چمن خراماں ہے
بہار باغ میں کیا کیا کھلا رہی ہے گل — شگفتہ غنچہ منقار عندلیباں ہے
چمن میں سیکھے اشارہ جو سوئے نخل حنا — تو ساتھ اشارے کے انگلی برنگ مرجاں ہے
ریاض دہر میں ٹھہرے تو سایہ کی صورت — مراد دل عقب آرزو شتاباں ہے
چمن میں بات جو کیجیے تو منہ سے پھول جھڑیں — اب ان دنوں میں یہ فیض بہار گلستاں ہے

زمیں پہ دانہ جو پھینکا تو گر کے نخل ہوا
نمو کی سعی سے صیاد سخت حیراں ہے

گرا زمیں پہ اگر کوئی موتیے کا پھول
صفا سے گوہر غلطاں کی طرح غلطاں ہے

کہیں ہے آئینے سے صاف تر زمین چمن
کہ اس سے سبزۂ نارستہ تک نمایاں ہے

نہال گلشن تصویر بھی ثمر لائے
بہار کا چمن دہر میں یہ فیضاں ہے

لگا ہے جو شجر بار در میں آگ سنگ
نگیں کی طرح سے اس میں شجر نمایاں ہے

ہے شوق گل میں عجب رنگ آج گلچیں کا
جو دیکھیے تو گریباں بھی شکل داماں ہے

نسیم جانب گلشن چلی یہ کہتی ہوئی
اگر ہوائے آتش نمرود دم میں بستاں ہے

زبان حال سے کہتی ہے موج نکہت گل
اب ان دنوں یہ ہجوم گل گلستاں ہے

کہاں تلک بھرے دامن میں پھول اب گلچیں
چمن میں خرمن گل اس کے تا گریباں ہے

حروف سے خط مسطر ہوں جیسے پوشیدہ
اسی روش سے روش زیر سبزہ پنہاں ہے

قلم میں پھٹے ہے بالیدگی سے وقت رقم
ہر ایک سطر مگر شاخ عشق پیچاں ہے

زمیں پہ دھوکے سے دوڑائے ہاتھ گلچیں نے
کہ اپنے سائے پہ اس کو خیال ریحاں ہے

ہوا کے جھونکے سے اڑ کر گرا جو یوسف گل
تو چاہ باغ عنادل کو چاہ کنعاں ہے

بجا ہے کہیے ہر اک گل کو غنچہ باغ اگر
ستون خانۂ شمشاد و باغ یکساں ہے

نہ کس طرح سے گلستان ہند ہو سرسبز
کہ دست فیض گلستاں شہاں باراں ہے

یقیں ہے سیر کو اب آئے بلبل شیراز
کہ گل نشاط سے ہندوستاں گلستاں ہے

سمجھ کے دار اماں آ رہی ہے یہاں خلقت
کہ شہر کشتی نوح و زمانہ طوفاں ہے

مطلع

تو وہ ہے شاہ تن ہند کے لئے جاں ہے
فروغ دیدۂ ایماں چراغ توراں ہے

وہ نخل ہے چمن سلطنت میں تیرا قدم
کہ جس میں برگ عدالت ہے بار احساں ہے

ہے تیرے سایے میں شاہا ہر اک قریب و بعید
کہ آفتاب کو نزدیک و دور یکساں ہے

خاک تکیے سے ہے نام سکندر روشن | روشنی دیکھتا گر دل کی صفائی کرتا
نہیں گر سر شغل باغ جہاں میں غافل | ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا
شہر آنکھیں سے لیے جاتا ہے کدھر تو کہیے | ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

۲

دیکھتے ہیں جلوۂ گلہائے رنگا رنگ ہم | مثل نرگس کے ہیں جبتک اپنی دونوں چشم وا
آفرینش ہوگا وہی اک دن خزاں کے ہاتھ سے | جبکہ عالم تھا اس نشو و نما سے پہلے تھا
ہے غنیمت کوئی دم تماشائے باغ و بہار | پھر کہاں یہ گلشن اور گل اور یہ سبزہ ہوا

۳

دل عبادت سے چرا اور جنت کی طلب | کام چور اس کام پر کس منہ سے اجرت کی طلب
دل مسلک ہوا نے جبتک ہو نہ پیدا بے نیاز | کہو یہاں کیا سوز محبت کی طلب
جو حلاوت زندگی کی چاہتا ہے شیخ سے | کس لیے زہر آب سے کرتا ہے شربت کی طلب
گر گلستان جہاں میں تنگ ہے تو غنچہ آ | کر کشادہ دل سے اپنے ذوق وسعت کی طلب

۴

وقت پیری شباب کی باتیں | ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
پھر مجھے لے چلا ادھر دیکھو | دل خانہ خراب کی باتیں
واعظا چھوڑ ذکر نعمت خلد | کہہ شراب و کباب کی باتیں
جاگ ہوتا ہے اور بھی خفقان | سن کے ناصح عتاب کی باتیں
ذکر کیا جوش عشق میں اے ذوق | ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

۵

سیر کو دنیا کی ہوس خوار لیے پھرتی ہے | کون پھرتا ہے یہ مردار لیے پھرتی ہے
[illegible] سر گشتہ زمانے میں [illegible] | یہ ہوس گھر سے [illegible] لیے پھرتی ہے